پھینکا جا چکا تھا۔ حقیقی خطرہ دور ہو چکا تھا۔ لیکن توہمات باقی تھے۔ توہمات جو روشنی میں سامنے نہیں آتے۔ تاریکی میں دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ بدھو کی نگاہوں کے سامنے سانپ گزر چکا تھا لیکن لکیر باقی تھی وہ سانپ سے لڑ سکتا تھا لیکن اس میں اس قدر خود اعتمادی نہ تھی کہ لکیر کو سانپ بننے سے روک سکتا۔

بدھو خوف سے مغلوب ہو کر گھر کی طرف بھاگا۔ توہمات کے بھوت اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا اور بیٹھ کے بل چند گز پھسلنے سے کمر پر معمولی سی خراش آ گئی۔ بجلی کی چمک میں اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس پاس کچھ نہ تھا۔ اگر ہوتا تو وہ یقیناً مقابلے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ بجلی پھر چمکی۔ بدھو نے چلّا کر کہا۔ بدمعاش! اندھیرے میں پیچھا کرتے ہیں روشنی میں نہیں آتے۔

اس نے اٹھ کر پھر بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن اسے یاد آیا۔ بھوت ڈر کر بھاگنے والے کا پیچھا نہیں چھوڑا کرتے۔ یہ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ تاہم ہر دو تین قدم کے بعد وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا ــ گاؤں میں پہنچ کر بدھو نے دیکھا کہ گاؤں کی کشادہ گلیاں، ندیوں اور نالوں میں تبدیل ہو چکی ہیں وہ اپنے گھر کا رُخ کرنے کی بجائے سیدھا سکھدیو کے گھر پہنچا۔

سیلاب

سکھدیو کی جھونپڑی کے ایک کونے میں مٹی کے چھوٹے سے چبوترے پر ایک دیا جل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو چار پائیوں پر شانتا اور رمادھو لیٹے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں دو چار پائیوں میں سے ایک پر سکھدیو بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی گہری سوچ اور ذہنی کش مکش کا پتہ چلتا تھا۔ دوسری چار پائی پر کنول پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کنول نے پوچھا "آج آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ دیوتا کیا بلا ہے؟"

سکھدیو نے کنول کی طرف دیکھا اور جواب دیا "میں اس وقت دیوتا کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا۔ کنول تمہیں اپنا وطن یاد آتا ہے یا نہیں؟"

سکھدیو کے ان الفاظ نے کنول کی نگاہوں سے ماضی کے نقاب الٹ دیئے اور چند لمحات کے لیے وہ ان پہاڑوں، جھیلوں اور وادیوں میں کھو گئی

سکھدیو پھر بولا "کنول! مجھے آج تمہارا وطن یاد آتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے اس جگہ رہ کر اپنی عمر کا بہت سا حصّہ ضائع کر دیا ہے۔ قید سے رہا ہونے کے بعد اگر میں اس طرف آنے کی بجائے دریائے بیاس عبور کر کے پھر ایک بار تمہاری برادری کے لوگوں میں پہنچ جاتا تو میں ایک بہت بڑا کام کر سکتا تھا۔ وہ لوگ بہت اچھے تھے انہیں صرف ایک فوجی رہنما کی ضرورت تھی۔ میں چند مہینوں میں انہیں سپاہی بنا دیتا اور انہیں متحد کر کے راجہ کی فوجوں کے سامنے

ایک لوہے کی دیوار کھڑی کر دیتا۔ کنول پھر تم اپنے ملک کی رانی ہوتیں اور میں تمہاری فوجوں کا سیناپتی ہوتا۔ سماج کے بڑے بڑے راجے تمہارے مقابلے کے لیے آتے اور میں انہیں شکست دیتا۔"

کنول نے بھولے پن سے جواب دیا" کنول کو رانی کہلانے میں وہ خوشی نہ ہوتی جو آپ کی داسی کہلانے میں ہے اگر آپ وہاں جاتے تو بھی میں اپنی خوشی سے آپ کو لڑائی میں نہ جانے دیتی۔ ہم پہاڑوں میں کہیں دور جا کر اپنی جھونپڑی بنا لیتے اگر اب بھی آپ کا ارادہ ہو تو ان پہاڑوں میں ایسے مقام ہوں گے جہاں راجہ کی فوجیں نہیں پہنچی ہوں گی۔"

سکھدیو نے کہا" کنول! شاید حالات ایسے ہو جائیں کہ ہمیں جانا ہی پڑے لیکن اب وہاں میرے لیے کیا دلچسپی ہوگی۔ تمہاری قوم اب سماج کی غلامی کی عادی ہو چکی ہوگی۔ وہ اپنی آزادی چھیننے والوں کو دیوتا سمجھنے لگے ہوں گے۔ ان کی حالت اب وہی ہوگی جو ہمالے کے راجہ کے شہر کے آس پاس رہنے والے شودروں کی تھی۔"

کنول نے کہا" میں نے سنا ہے کہ راموسماج سے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

سکھدیو نے جواب دیا" وہ بے وقوف ہے۔ ان بستیوں میں چرواہوں کی آبادی مرد عورتیں اور بچے ملا کر دس ہزار بھی نہیں اور وہ ان لوگوں کے بل بوتے پر راجہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"آج جب آپ باہر گئے تھے تو اس کی بیوی میرے پاس آئی تھی وہ کہتی تھی میں رانی بنوں گی۔"

"چڑیل کہیں کی!" شانتا دوسرے کونے سے یہ کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ کنول اور سکھدیو ہنسنے لگے۔

سکھدیو نے پوچھا" بیٹی! ابھی تم جاگ رہی ہو؟"

"پتا جی! سو رہی تھی۔ سپنے میں دیوتا کو دیکھ کر ڈر گئی"

"سو جاؤ بیٹا! وہ کوئی خوفناک چیز نہیں۔"

"چچا! بدھو کہتا تھا اس کی زبان بہت لمبی ہے وہ بچوں کو کھا جاتا ہے۔"

"بدھو جھوٹ کہتا تھا تم سو جاؤ۔"

شانتا لیٹ گئی۔ لیکن کچھ سوچ کر پھر اٹھی۔ اور مادھو کے سرھانے جا بیٹھی۔ اس نے مادھو کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے کہا: "بھیا صبح دیوتا کو دیکھنے چلیں گے۔"

مادھو نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ "چلی جا چڑیل کہیں کی۔ پتا جی! یہ سونے نہیں دیتی۔"

کنول نے برہم ہو کر کہا۔ شانتا! اسے کیوں تنگ کرتی ہو۔ اگر اس نے ایک چپت رسید کر دی تو پھر آدھی رات تک روتی رہو گی۔"

شانتا پھر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر چھت کی طرف دیکھنے کے بعد بولی: "ماتا! بارش کہاں سے آتی ہے؟"

کنول خاموش رہی لیکن مادھو نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"بادلوں سے اور کہاں سے؟"

"بادل کہاں سے آتے ہیں؟"

"پہاڑوں سے۔"

"پہاڑ کہاں سے آتے ہیں؟"

مادھو خاموش ہو گیا۔ شانتا نے سکھدیو سے پوچھا۔ پتا جی! پہاڑ کہاں سے آتے ہیں؟"

"تمہارے سر سے" کنول نے برہم ہو کر کہا۔ "اب سو جاؤ نہیں تو مار کھاؤ گی"
شانتا نے آنکھیں بند کر لیں لیکن تھوڑی دیر بعد پھر بولی۔

"ماتا جی!"

"کیا ہے؟" کنول نے سختی سے کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں تو مجھے کیوں بلایا تھا؟"

"ماتا جی! چاچا بدھو آج نہیں آیا۔"

"نہیں آیا تو میں کیا کروں ایسی بارش میں وہ کیسے آ سکتا ہے؟"

باہر پانی اور کیچڑ میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ شانتا "چاچا بدھو! چاچا بدھو!" کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ بدھو نے دروازے کے قریب آ کر آواز دی "بھیا!"

شانتا نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ بدھو اندر داخل ہوا۔ سکھدیو نے کہا "بدھو! تمہیں بارش میں بھی آرام نہیں آتا۔ سردی لگ جائے گی۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"گھر سے۔"

"نہیں تمہارے تمام کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم دیر سے بارش میں پھر رہے ہو؟"

"بھیا بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے۔ ذرا باہر نکل کر تو دیکھو۔ کپڑے بھیگتے ہیں یا نہیں۔"

"لیکن تم کانپ بھی رہے ہو۔"

کنول نے کہا "بھیا! کرتہ اتار کر یہ چادر لپیٹ لو۔ میں اسے نچوڑ دیتی ہوں"

"نہیں یہ ابھی سوکھ جاتے گا۔" یہ کہہ کر بدھو سکھدیو کی چارپائی کی پائنتی سے کپڑا ایک طرف ہٹا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

"بھیا! معلوم ہوتا ہے کہ رامو کا یہ دیوتا بہت منحوس ہے ایسی بارش کبھی نہیں ہوئی تھی اگر صبح تک یہی حالت رہی تو دریا کا پانی اس طرف چڑھ آئے گا اگر دریا کا پانی نہ بھی آیا تو بھی ہمیں بکریوں اور بھیڑوں کی خاطر کسی ٹیلے پر جانا پڑیگا میں ابھی جانوروں کا چھپر دیکھ کر آیا ہوں۔ اندر پانی کافی آگیا ہے۔ جھیل بھر گئی ہے اور پانی ہماری بستیوں کا رُخ کر رہا ہے۔"

جھیل کا نام سن کر سکھدیو چونک اٹھا "تم جھیل پر سے ہو کر آئے ہو؟"

"بھیا! وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ باہر نکل کر دیکھ لیں۔ گاؤں کی گلیاں ندی نالے بنی ہوئی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ رامو، نتھو اور لکھو کی بستیاں بہہ جائیں گی۔ رامو کا گاؤں سب سے نیچے ہے۔ اگر اس کی بستی بہہ گئی تو وہ یہی کہے گا کہ دیوتا نے کسی کے جرم کا بدلہ لیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہے گا کہ مجھے جھوٹ بولنے کی سزا ملی ہے۔"

سکھدیو نے حیران ہو کر پوچھا "کیسا جرم؟"

بدھو پریشان ہو کر سکھدیو کی طرف دیکھنے لگا۔ سکھدیو کو سنجیدہ دیکھ کر اسے اعترافِ جرم کی جرأت نہ ہوتی اگر وہ سکھدیو کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم بھی دیکھ لیتا تو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر یہ کہہ دیتا: "بھیا! میں اس مصیبت کو ختم کر آیا ہوں لیکن سکھدیو کی تیز نگاہیں اس کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوئیں اس نے گھبرا کر جواب دیا "وہ یہ کہے گا کہ تم نے دیوتا کو کھٹے آم کھلائے ہیں"

شانتا نے پوچھا "چاچا وہ آم کھاتا ہے؟"

بدھو نے جواب دیا "وہ نہیں کھائے گا۔ رامو کھا کر اس کے آگے گٹھلیاں

اور چھلکے پھینک دے گا۔

کنول ہنس پڑی۔ سکھدیو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بدھو! تم اب بہت چالاک ہوتے جاتے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم تمہاری وجہ سے کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔"

سکھدیو نے ہنستے ہوئے یہ بات کہی تھی لیکن بدھو اسے برداشت نہ کر سکا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے سکھدیو کی طرف دیکھا۔ "میری وجہ سے تم مصیبت میں پھنس جاؤ؟ بھیا! تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ بدھو کہیں ڈوب کر مر جائے۔"

"ارے! تم ناراض ہو گئے۔ میں نے تو تمہاری تعریف کی تھی۔ اچھا اب بنسری سناؤ!"

بنسری بجانے کی درخواست پر بدھو سب کچھ بھول گیا۔ اس نے کہا۔ "میری بنسری تو گھر ہے۔"

"شانتا! مادھو کی بنسری دینا!"

مادھو ہمیشہ بنسری سرہانے رکھ کر سوتا تھا۔ شانتا نے اٹھ کر بنسری اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پر چٹکی لی۔ مادھو بلبلاتا ہوا اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا۔ "شانتا! یہ پھر چھیڑ رہی ہے۔ میں نے پیٹا تو پھر نہ کہنا۔"

کنول نے ڈانٹ کر کہا۔ "شانتا بہت شریر ہو گئی تم!"

شانتا بدھو کو بنسری دے کر پھر اپنی جگہ جا بیٹھی۔ مادھو لیٹ گیا لیکن بنسری کی لے کانوں میں پڑتے ہی "چچا بدھو، چچا بدھو" کہتا ہوا پھر اٹھ بیٹھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ مادھو، شانتا اور کنول بنسری کی میٹھی تانوں میں کھو کر سو گئے۔ سکھدیو کی آنکھوں پر غنودگی طاری ہو رہی تھی لیکن اس

نے بدھو کی دل شکنی گوارا نہ کی۔ ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا اور بدھو کی بنسری کی آخری تان بارش کے زناٹے میں فنا ہو گئی۔

اس نے کہا "بھیا! دیا بجھ گیا میں جاتا ہوں۔"

سکھدیو نے کہا۔ "یہیں پڑے رہو۔ میں مادھو کے ساتھ سو جاتا ہوں۔"

"نہیں بھیا! میں بکریوں کی خبر لیتا ہوں۔ بارش بند نہیں ہوئی۔ صبح تک دریا کا پانی ضرور آ جائے گا۔"

یہ کہہ کر بدھو اٹھا لیکن دروازے کے قریب جا کر رک گیا۔ سکھدیو کا چہرہ جس کی سنجیدگی اور متانت نے اس وقت تک اس کے ہونٹوں پر مہر لگا رکھی تھی اب تاریکی میں تھا۔ بدھو کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی انتہائی جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "بھیا!"

"کیا ہے بدھو؟" بدھو کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ الفاظ اس کے ہونٹوں پر آ کر رک گئے۔ "بھیا ...... میں ...... میں جاتا ہوں۔" بدھو نے یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا ہوا باہر نکل گیا۔

بدھو کے جانے کے بعد سکھدیو ٹانگیں دراز کر کے لیٹا ہی تھا کہ گاؤں کے مختلف اطراف سے عورتوں، مردوں اور بچوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ اس نے اٹھ کر کنول کو جگایا اور کہا "کنول شاید پانی آ گیا۔ مادھو اور شانتا کو جگاؤ شاید ہمیں بھاگنا پڑے۔"

کنول نے بستر سے اٹھ کر پاؤں نیچے رکھتے ہی گھبرا کر کہا "پانی تو ہمارے مکان کے اندر بھی آ گیا ہے اُون بھیگ گئی ہوگی۔"

"یہ اون کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں۔ ہمارا مکان کافی اونچی جگہ ہے اگر اس جگہ پانی آ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آس پاس کی جھونپڑیاں اس

ت سیلاب میں بہہ رہی ہوں گی۔"

صحن میں مویشیوں کے چلنے کی آہٹ پا کر سکھدیو نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ بدھو تین گدھے ہانکتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے چلّا کر کہا "بھیّا بھیّا!! جلدی کرو۔ دریا چڑھ آیا ہے۔ لوگ ٹیلوں کی طرف بھاگ رہے ہیں آپ جلدی سے گدھوں پر سامان لادیں۔ اتنی دیر میں میں بکریوں کو کسی اونچی جگہ چھوڑ آتا ہوں۔" یہ کہہ کر بدھو، سکھدیو کے جواب کا انتظار کیے بغیر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

---

(۲)

علی الصباح بدھو، سکھدیو اور اس کے بال بچے بستی سے تقریباً ایک کوس اور نئے دیوتا کے ٹیلے سے قریباً آدھ کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑے آس پاس کے ٹیلوں کی طرف بھاگ کر پناہ لینے والے لوگوں کی چیخ پکار سن رہے تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ فضا میں پورب اور پچھم کے افق پر چھائی ہوئی کالی گھٹاؤں کے درمیان سفید بادل کے ہلکے سے نقاب کے نیچے مختلف رنگوں اور شکلوں کے بادل مشرق سے مغرب کا رخ کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندروں کے بادشاہ نے جس لشکر کو ہمالیہ کی عظمت اور تقدیس پر اپنی دولت کے خزانے نچھاور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اپنی پونجی کا کچھ حصّہ بچا کر پنجاب کے وسیع میدانوں کا رخ کر رہا ہے۔

دریائے راوی میلوں میں پھیل چکا تھا۔ پانی بدستور چڑھ رہا تھا۔ بستیوں میں بانس اور سرکنڈے کی جھونپڑیاں کہیں نظر نہ آتی تھیں کہیں کہیں مٹی کے مکانوں کے کچھ حصے پانی کی سطح سے اوپر نظر آ رہے تھے لیکن وہ

بھی آہستہ آہستہ منہدم ہو کر پانی کی آغوش میں روپوش ہوتے چلے جا رہے تھے۔

آس پاس کے ٹیلوں پر عورتوں کی گریہ وزاری سے معلوم ہوتا تھا کہ بستیوں کے تمام باشندے صحیح سلامت ٹیلوں پر نہیں پہنچ سکے۔ یہ ٹیلے اب ایک وسیع جھیل کے چھوٹے چھوٹے ٹاپو بن چکے تھے اور بڑھتے ہوئے سیلاب نے ان کے درمیان آمد و رفت کے راستے بند کر دیے تھے۔

سکھدیو ان لوگوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے ارادے سے کئی بار پانی میں تیر کر آس پاس کے ٹیلوں پر جانے کے لیے تیار ہوا لیکن کنول اور بدھو نے اسے ہر بار روک لیا۔ بدھو بار بار یہ کہتا: "بھیّا! اتنی دور تیر کر جانا آسان نہیں اور یہ سب بے وقوف ہمارے دشمن ہیں ہمیں ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے ہم پانی اترتے ہی کہیں دور چلے جائیں گے۔"

بدھو کے تمام دلائل سکھدیو کو یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ کر سکے کہ یہ لوگ اس کے دشمن ہو سکتے ہیں لیکن کنول کی التجاؤں اور بڑھتے ہوئے سیلاب نے اسے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا۔

سکھدیو کا ارادہ بھی نہ تھا کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر پناہ لے لیکن رات کے وقت جب بدھو مویشی لے کر بستی سے نکلا تو اس نے راستے میں کئی ٹیلے چھوڑ کر اپنے لیے وہ جگہ منتخب کی جہاں کسی اور کے آنے کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔ رات کے وقت چرواہوں کی اکثریت نے نئے دیوتا کے اونچے اور کشادہ ٹیلے کا رخ کیا اور بعض نے بدھو کو بھی اپنے ساتھ کھینچنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے صاف کہہ دیا تھا۔ "نہ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں اور نہ تم ہمارے ساتھ آؤ۔"

---

(۱۴)

شانتا اور مادھو، سکھدیو، کنول اور بدھو سے ذرا ہٹ کر ایک طرف بیٹھے مٹی کے گھروندے بنا رہے تھے۔ مادھو نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "شانتا! دیکھو، بادل بھاگ رہے ہیں۔ یہ اب اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے اور تھوڑی دیر بعد سورج نکل آئے گا۔"

شانتا نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "نہیں بھیا! یہ اب بھیڑ بکریاں اور گائیں بھینسیں بن کر بڑی بڑی جھیلوں کی طرف جا رہے ہیں وہاں سے پانی پی کر آئیں گے اور پھر بارش ہوگی۔"

"اگر اور بارش ہوئی تو بستی کی طرح یہ ٹیلا بھی ڈوب جائے گا۔ پھر ہم کہاں جائیں گے!"

"اونچے اونچے درختوں پر چڑھ جائیں گے۔"

"اور ہماری بھیڑیں؟"

شانتا سوچ میں پڑ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے جواب دیا "ہم درختوں پر نہیں چڑھیں گے پہاڑوں کی طرف چلے جائیں گے۔ چچا بدھو کہتا تھا، پہاڑ درختوں سے بہت اونچے ہوتے ہیں۔ مادھو! تم نے پہاڑ دیکھے ہیں؟"

"نہیں۔"

"چچا بدھو کہتا تھا کہ میں نے پہاڑ دیکھے ہیں وہاں زمین میں سوراخ ہوتے ہیں جن سے ہر وقت ٹھنڈا میٹھا اور صاف پانی بہتا رہتا ہے۔ ان کی چوٹیاں بادلوں سے بہت قریب ہوتی ہیں۔ اگر ہم وہاں گئے تو بادلوں کے ساتھ کھیلا کریں گے۔ یہ بہت تیز بھاگتے ہیں۔ وہاں لوگ ان پر سواری کرتے ہوں گے!"

مادھو نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "میں بھی وہاں جا کر بادل پر سواری کیا کروں گا۔"

"اور میں بھی۔"

"نہیں تم نہیں! لڑکیاں بادلوں پر سواری نہیں کرتیں۔"

یہ کہہ کر مادھو نے بدھو کی طرف دیکھا "چچا بدھو! چچا بدھو! میں پہاڑ پر جاؤں گا۔ بادلوں پر سواری کیا کروں گا۔ تم بھی چلو گے نا؟"

"ہاں بیٹا! ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

مادھو نے سکھدیو اور کنول کی طرف دیکھا "ماتا! پتا جی! ابھی اور بھی بارش ہوگی۔ یہ ٹیلا ڈوب جائے گا۔ چلو پہاڑ کی طرف چلیں۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ماتا! تم نے پہاڑ دیکھے ہیں؟"

کنول نے جواب دینے کی بجائے سکھدیو کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

مادھو پھر بولا "ماتا! تم نے پہاڑ نہیں دیکھے؟"

"بیٹا! میں پہاڑوں کے قریب پیدا ہوئی تھی۔"

"وہاں زمین سے پانی نکلتا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔" کنول پھر سکھدیو کی طرف دیکھنے لگی۔

سکھدیو نے کہا "کنول ہم وہاں جائیں گے۔"

مادھو، سکھدیو کی ٹانگوں سے لپٹ گیا "پتا جی کب جائیں گے؟"

"جب پانی اتر جائے گا۔"

کنول بولی "لیکن وہاں آپ کے دشمن ہوئے تو؟"

"اب ہمیں کون پہچانے گا تمہاری قوم کو یہ خیال تک نہیں آئے گا کہ تم ان کے سردار کی لڑکی ہو۔ اب اگر راجہ کے سپاہی بھی وہاں موجود ہوں تو انہیں شک بھی نہیں ہوگا کہ میں کبھی ان کا سیناپتی تھا۔ کنول ہم وہاں ضرور جائیں گے۔"

بدھو ان باتوں میں بہت دل چسپی لیتا تھا لیکن اس کی ساری توجہ نئے دیوتا کے ٹیلے کی طرف تھی۔ وہ اس بلند ٹیلے پر ہجوم کی صرف معمولی سی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ اتنی دُور سے کسی کی آواز اس کے کانوں میں نہیں آسکتی تھی۔ تاہم وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ تمام اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ اس کا وہم غلط بھی نہ تھا۔ نئے دیوتا کے پجاریوں کو مورتی کا سر گم ہو جانے کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔

بدھو کی بستی کے کئی چرواہے اس کی کلہاڑی جو وہ رات کے وقت بدحواسی کے چبوترے پر چھوڑ آیا تھا پہچان چکے تھے وہ اپنی تباہی اور بربادی کی تمام تر ذمہ داری بدھو کے سر تھوپنا چاہتے تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جو اس مورتی کو توڑنے والے کی بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن راموا پنی پُرجوش اور مدلل تقریروں سے یہ ثابت کر چکا تھا کہ تمہارا اصلی دشمن بدھو نہیں سکھدیو ہے۔ بدھو ایک بے وقوف انسان ہے وہ اپنے ارادے سے ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ بدھو کو ایسی حرکت پر یقیناً سکھدیو نے اکسایا ہوگا۔ سکھدیو سماج کا بیٹا ہے اور ہمارے احسانات اسے ہمارا بھائی نہیں بنا سکے وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا دیوتا ہماری مدد پر ہو جس کی بدولت ہم ترقی کریں۔ ہم اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لیں اور سماج والوں کی برابری کریں۔ وہ دشمن کا جاسوس ہے۔ سماج والوں کو اس بات کا خوف ہوگا کہ ہم کسی وقت ایک طاقت ور دیوتا کی مدد سے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے کئی سال پہلے ہی ہمارے پاس اپنا

جاسوس بھیج دیا ہم نے اُن کی ہر طرح خدمت کی لیکن اس خدمت کا اس نے آج یہ پھل دیا ہے کہ ہمیں آس پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ ہم سب پر یہ مصیبت فقط دیوتا کے ساتھ بدسلوکی کی وجہ سے آئی ہے۔ جو بچے عورتیں اور مرد ڈوب مرے ہیں ان کا خون سکھدیو کے سر ہے۔ تم سب بیوقوف ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے بدلہ نہیں لو گے لیکن دیوتا اپنا بدلہ لے گا اور ضرور لے گا۔ دیوتا مرا نہیں کرتے روپ بدلا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا دیوتا کسی نہ کسی دن نئے روپ میں یہاں آجائے گا۔ سکھدیو اس کے غضب سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اس نے پاپ کیا ہے اسے سزا ضرور ملے گی۔"

---

(۴)

شام کے وقت مطلع صاف ہو چکا تھا۔ سورج کی چمک آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ شفق کی سرخی پانی کی تہہ میں آگ کے ایک کانپتے ہوئے ستون کی طرح نظر آتی تھی پھر ڈوبتے ہوئے سورج کی پیشانی پانی کی سطح کو چھونے لگی اور آگ کا مینار پانی کی سطح کے نیچے پھیل کر خون کا دریا بن گیا۔

بالآخر بزم کائنات کی شمع پردوں میں چھپ گئی اور روئے زمین پر اُداسی کے تاریک بادل چھا گئے لیکن آسمان نے سورج کی ایک مشعل سے محروم ہو جانے پر ستاروں کے ہزاروں چراغ جلا لیے۔

ایک پہر رات گزر جانے پر مشرق کی ایک پہاڑی کے عقب سے دھیمی سی روشنی کی کرنیں نمودار ہو کر آسمان پر نصف دائرے میں پھیل گئیں اور تھوڑی دیر میں پہاڑی کی چوٹی پر چاند کا نقرئی تاج نظر آنے لگا۔

بدھو نے دن کے وقت ٹیلے کے آس پاس پانی میں ڈوبے ہوئے کیکر کے درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر کافی ایندھن جمع کر لیا تھا لیکن سوکھی لکڑیاں نہ ہونے کی وجہ سے وہ مچھلی پکانے کے لیے آگ نہ جلا سکا۔ دن بھر ٹیلے پر اُگی ہوئی گھاس کے تنکے نوچنے کے باوجود بکریاں اور بھیڑیں سیر نہ ہوئی تھیں۔ تاہم ان کا تھوڑا بہت دودھ اُن کے لیے کافی تھا۔ شانتا اور مادھو کو خالی دودھ پی کر تسلی نہ ہوئی۔ رات کے وقت جب وہ بدھو کے قریب لیٹے اس سے کہانی سُن رہے تھے۔ شانتا نے مادھو کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا اور وہ پانی پینے کے بہانے اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آکر شانتا کے قریب بیٹھ گیا۔ مادھو کی مٹھیاں بند دیکھ کر شانتا اس کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئی اور اٹھ کر دونوں ہاتھ مادھو کی طرف پھیلا دیئے۔ مادھو نے بدھو کی طرف دیکھا اور رہاں چچا کہہ کر شانتا کے ہاتھوں میں کچے چاولوں کی مٹھی کھول دی۔ تھوڑی دیر بعد بدھو بات سناتے سناتے اچانک رک گیا اور بولا "تم کیا کھا رہے ہو؟" دونوں مُنہ بند کرکے بدھو کی طرف دیکھنے لگے۔

شانتا نے جھک کر بدھو کے کان میں کہا "چچا منہ کھولو!"

بدھو نے منہ کھولا اور شانتا نے جلدی سے چاول کے چند دانے اس کے منہ میں گرا دیئے۔ بدھو "اوں ہوں، پگلی کہیں کی" کہہ کر خاموش ہو گیا اس کے بعد تینوں بے تکلف چاول چبا رہے تھے۔

اپنا اپنا حصہ ختم کرنے کے بعد تینوں ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔

"چچا میں اور لاتا ہوں" یہ کہہ کر مادھو پھر اٹھا دبے پاؤں مٹکے کے قریب جا کر بیٹھ گیا چاول کی چند مٹھیاں نکال کر جھولی میں ڈالیں اور واپس آکر بدھو کے قریب بیٹھ گیا "ارے یہ بہت زیادہ ہیں۔" بدھو نے یہ کہہ کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

رامو کا انتقام

رات کے تیسرے پہر کنول کی دردناک چیخ نے بدھو کو گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر کنول سکھدیو کے سینے پر سر رکھے منہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس چیخ کو محض اپنا وہم سمجھتے ہوئے دوبارہ لیٹ جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے سکھدیو کے کراہنے کی آواز آئی۔

بدھو سہمی ہوئی آواز میں پکارا "بھیا!"

سکھدیو نے جواب دینے کی بجائے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کا بازو ہوا میں کھڑا رہا اور پھر گوشت کے ایک بے جان لوتھڑے کی طرح نیچے آگیا۔ بدھو دہشت زدہ ہو کر "بھیا! بھیا! بھیا!" کہتا ہوا سکھدیو کی طرف بھاگا۔ قریب پہنچ کر اس نے ایک ہیبت ناک منظر دیکھا اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ سکھدیو کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا کنول کا ایک بازو جو سکھدیو کے سر کے نیچے تھا خون سے تر ہو چکا تھا۔ وہ سکھدیو کے سینے پر پیشانی رکھے گہری نیند میں مدہوش دکھائی دیتی تھی۔ بدھو چند لمحے مبہوت کھڑا رہا۔

"یہ وہم ہے میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں!" بدھو نے چند بار آنکھیں بند کر کے اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دینے کی کوشش

کی لیکن صبح کی تر و تازہ ہوا کے چند جھونکوں نے اس کی تمام جسمانی صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ وہ ایک دردناک آواز میں "بھیّا! بھیّا!" کہتا ہوا سکھدیو کے قریب بیٹھ گیا۔ جب وہ سکھدیو کا ہاتھ ہلانے اور زور زور سے آوازیں دینے کے بعد مایوس ہو گیا تو وہ "بہن بہن" کہتا ہوا کنول کے کندھوں کو مضبوط ہاتھوں میں پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ شانتا اور مادھو اپنے بستر سے اٹھ کر پریشانی کی حالت میں چیختے چلاتے اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

کنول نے چند بار گہرے سانس لینے کے بعد آنکھیں کھول لیں۔ بدھو نے انتہائی بے قراری کی حالت میں پوچھا "بہن کیا ہوا۔ کیا ہوا بہن! بتاؤ میرے بھائی، میرے دوست کو کیا ہوا؟" کنول کچھ دیر سکتے کے عالم میں بدھو کی طرف دیکھتی رہی لیکن اچانک اس کی رگوں میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ برق کی سی تیزی سے اٹھی۔ بھاگ کر ٹیلے سے نیچے اتری اور پانی کے کنارے جا کھڑی ہوئی۔ بدھو بھی بھاگ کر اس کے قریب پہنچا کنول نے پانی کی طرف اشارہ کیا اور کہا وہ جا رہا ہے۔ بدھو میں ان کا بدلہ ضرور لوں گی۔" وہ بھاگ کر پھر ٹیلے پر چڑھ گئی۔ بدھو غور سے پانی کی طرف دیکھنے لگا۔ کنارے سے کچھ دور اسے پانی میں کوئی متحرک شے نظر آ رہی تھی۔ "یہ رامو ہے۔ یہ رامو ہے۔" اس کے دل نے گواہی دی۔

تھوڑی دیر بعد کنول واپس آئی اس کے ہاتھ میں سکھدیو کی تلوار تھی وہی تلوار جو آج سے کئی برس پہلے اسے رام داس نے دی تھی۔ کنول کنارے پر پہنچ کر پانی میں کودنے کو تھی کہ بدھو نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ کنول۔۔! سکھدیو کا بھائی ابھی زندہ ہے تم بچوں کی خبر لو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے خالی ہاتھ پانی میں چھلانگ لگا دی۔

وہ بے پناہ قوت جو انتقام کے جذبے نے ایک لمحے کے لیے کنول کے دل میں بیدار کر دی تھی اچانک رخصت ہو گئی۔ واپس ٹیلے پر چڑھتے ہوئے شانتا اور مادھو کی چیخ پکار سن کر اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ اپنی ٹانگوں پر ایک غیر معمولی بوجھ محسوس کرنے لگی۔ وہ اپنے شوہر کا انتقام لینے کے لیے زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر طوفان کی موجوں میں کود سکتی تھی لیکن اپنی زندگی کے چراغ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر خاموش رہنا اس کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔ وہ ایک انتہائی المناک حقیقت کا سامنا کرنے سے پہلے اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دینے کے لیے چند بار چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے سراپا بے کسی کی تصویر بن کر آسمان کی طرف دیکھا اور اپنی نحیف آواز میں کہا:

"اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! میری زندگی انہیں عطا کر دے اس بے رحم دنیا میں میرے بچوں کو مجھ سے زیادہ ان کی ضرورت ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ کنول کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور چمکتا ہوا چاند اور ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ سکھدیو کی طرف بڑھی۔ مادھو اور شانتا روتے ہوئے بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ ماتا نے اس کی مردہ رگوں میں پھر ایک بار جان ڈال دی۔ اس نے پیار سے بچوں کو ایک طرف ہٹایا اور سکھدیو کے قریب بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

مادھو نے ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا "ماتا! پتا جی کو کیا ہوا؟ ان کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔"

"بیٹا! تم بھاگ کر کٹورے میں پانی لاؤ۔"

مادھو نے شانتا کی طرف دیکھا اور کہا "شانتا! تم میرے ساتھ آؤ۔

مجھے ڈر لگتا ہے۔"

مادھو اور شانتا پانی لے کر آئے۔ کنول نے بڑی مشکل سے سکھدیو کے دانتوں میں انگلیاں دے کر اس کا منہ کھولا۔ مادھو نے پانی کا کٹورا منہ سے لگا دیا۔ پانی کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد سکھدیو نے آنکھیں کھولیں یکے بعد دیگرے مادھو، شانتا اور کنول کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا "بدھو کہاں ہے؟"

کنول نے محسوس کیا کہ زبردست اور انصاف پسند طاقت کے سامنے اس کی دعا رائیگاں نہیں گئی۔ اس نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا "آپ کے سر پر معمولی زخم آیا ہے۔ بدھو ابھی آجائے گا وہ ابھی ابھی آپ کے دشمن کے پیچھے گیا ہے۔" سکھدیو نے کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔

کنول نے مادھو سے کہا "بیٹا! ذرا اپنے پتا کے سر کو سہارا دینا۔ میں پٹی باندھ دوں۔" مادھو نے دونوں ہاتھوں سے سکھدیو کے سر کو سہارا دیا اور کنول نے سکھدیو کی پگڑی کا کچھ حصہ پھاڑ کر اس کے سر پر پٹی باندھ دی اور پھر اس کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ سکھدیو نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کہا "کنول! شاید بدھو کو دیر ہو جائے اس سے کہہ دینا میں بچوں کو اسے سونپ کر جا رہا ہوں۔ اگر وہ نہ آیا تو پانی اتر جانے پر بچوں کو اپنے وطن واپس لے جانا۔ بیاس کے کنارے کنارے اوپر کی طرف چلتی جانا۔ تمہیں وہ پہاڑیاں دکھائی دیں گی۔ وہ پہاڑیاں۔۔۔۔!" سکھدیو کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

کنول نے کہا "آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ تندرست ہو جائیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

سکھدیو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مادھو اور شانتا کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کے سر اپنے سینے پر رکھ لیے اور پھر آنکھیں بند کر کے

اپنی نحیف و لاغر آواز میں کہنے لگا "اے زبردست اور انصاف پسند طاقت! ان کی حفاظت کرنا۔ تیرے سوا دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ کوئی نہیں" سکھدیو کے ہونٹ بدستور ہل رہے تھے لیکن ضعف کے باعث اس کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

صبح کے آثار نمودار ہونے سے پہلے سکھدیو نے چند بار اور آنکھیں کھولیں اور کچھ مبہم باتیں کیں۔ اس کے بعد اس پر بار بار غشی طاری ہو رہی تھی اور کنول ہر بار مادھو کی مدد سے اسے پانی پلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

---

(۲)

بدھو چرواہوں میں بہترین تیراک مانا جاتا تھا۔ وہ چند سال قبل برسات کے دنوں میں ایک چرواہے سے دو بکریوں کی شرط لگا کر دریا عبور کر چکا تھا۔ رامو کو یقین تھا کہ وہ سکھدیو کی موت خاموشی سے برداشت نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ ان دونوں کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتارنے کے ارادے سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں تک پہنچا تھا۔ لیکن سکھدیو اور بدھو ٹیلے کے دو مختلف کونوں میں ایک دوسرے سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر سو رہے تھے اور ان کے درمیان بھیڑیں اور بکریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رامو کو ان میں سے ایک پر وار کرکے فوراً دوسرے کے قریب جا کر حملہ کرنا آسان نظر نہ آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر ایک کے زخمی ہونے سے دوسرا بیدار نہ ہوا تو وہ دونوں کو ختم کر ڈالے گا ورنہ ایک پر ضرب کاری لگاتے ہی بھاگ جائے گا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ سکھدیو کے بعد بدھو اتنا خطرناک ثابت نہیں ہوگا جس قدر بدھو کے بعد سکھدیو

بدھو بے وقوف ہے لیکن سکھدیو مقابلے کی چوٹ ہے۔ بدھو کے انتقام سے بچنے کی امید ہو سکتی تھی لیکن سکھدیو کے انتقام کے تصور سے اس کا جی گھبراتا تھا۔

سکھدیو کے سر پر کلہاڑی کی ضرب نے کنول کو بیدار کر دیا اور اس کی خوفناک چیخ نے رامو کے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ اس نے بدحواسی کی حالت میں دوبارہ کلہاڑی بلند کی لیکن ان لوگوں میں عورت کا قتل ایک ایسا فعل تھا جس پر رامو جیسے انسان کا ضمیر بھی صدائے احتجاج بلند کیے بغیر نہ رہا۔ کنول زخمی شوہر کے سینے پر سر رکھ کر بے ہوش ہو گئی اور رامو نے کلہاڑی ٹیلے کے نیچے پھینک کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کچھ دیر اپنی پوری قوت سے تیرتا رہا۔ ٹیلے سے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر اس نے مڑ کر دیکھا جب کوئی پیچھا کرتا ہوا نظر نہ آیا تو وہ مطمئن ہو کر آہستہ آہستہ تیرنے لگا۔ جب بدھو نے پانی میں چھلانگ لگائی تو رامو کافی دور جا چکا تھا۔

بدھو تازہ دم تھا اور اس کی رفتار رامو کے مقابلے میں بہت تیز تھی اور دونوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ بدھو اب اسے چاند کی روشنی میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا اسے یقین تھا کہ اگر وہ پوری طاقت کے ساتھ تیرنا شروع کر دے تو رامو کو بہت جلد جا لے گا لیکن اسے یہ بھی خوف تھا کہ اگر رامو نے اسے دیکھ لیا تو وہ سیدھا بڑے ٹیلے کی طرف جانے کی بجائے آس پاس کے کسی چھوٹے ٹیلے پر پناہ لینے کی کوشش کرے گا اور ان ٹیلوں کے پناہ گزین اس کی حمایت کے لیے نکل آئیں گے۔ اس لیے اس نے منہ کے سوا اپنا سارا جسم پانی میں چھپائے رکھا اور رامو کو یہ شبہ نہ ہونے دیا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے آگے گزر کر جب بدھو کو یہ اطمینان ہو گیا کہ دشمن اب بڑے ٹیلے کے سوا کسی اور جائے پناہ کا رخ نہیں کر سکتا تو اس نے

للکار کر کہا: "بدمعاش! ٹھہر جاؤ!" اور پوری طاقت کے ساتھ پانی کو چیرتا ہوا رامو کی طرف بڑھنے لگا۔

رامو پرلے درجے کا عیار تھا لیکن نہ ٹلنے والی بلا سر پر دیکھ کر اس نے ایک لومڑی کی ذہانت سے کام لینے کی بجائے ایک درندے کی قوت فیصلہ سے کام لینا بہتر سمجھا۔ دیوتا کا ٹیلا جو اس کی آخری جائے پناہ تھی ابھی کافی دور تھا۔ اگر ٹیلا نزدیک ہوتا تو وہ یقیناً بدھو جیسے بے ڈھب آدمی کو اپنی سپاہیانہ صلاحیتوں کا ثبوت دینے کی بجائے بھاگ نکلنا زیادہ دانشمندانہ فعل خیال کرتا۔ لیکن اب مقابلے کے سوا چارہ نہ تھا۔ رامو نے اپنے قد کی بلندی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ذرا کم گہرے پانی میں پاؤں جمانے کا ارادہ کیا لیکن بدھو کی رفتار کی تیزی نے جس قدر مہلت اسے دی اس میں وہ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کوئی ایسی جگہ تلاش نہ کر سکا۔ پانی ہر جگہ اس کے قد سے زیادہ تھا وہ مایوس ہو کر دشمن کی طرف دیکھنے لگا۔ بدھو، رامو کے قریب آ کر رک گیا اس نے ہانپتے ہوئے کہا، "رامو! اب تم نہیں جا سکتے۔"

رامو نے فوراً تاڑ لیا کہ بدھو کا سانس پھولا ہوا ہے اور وہ تازہ دم ہو کر حملہ کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ موقع دیے بغیر پانی کو دونوں ہاتھوں سے چیر کر آگے بڑھا اور بدھو کا گلا دبوچنے کی کوشش کی لیکن بدھو نے اچانک غوطہ لگا دیا۔ رامو پریشان ہو کر ابھی پانی کی لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کے عقب سے بدھو کا سر نمودار ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر رامو کے سر کے بال پکڑ لیے اور دونوں پانی میں غائب ہو گئے۔

---

(۳)

"ماما! چچا آ گیا" شانتا نے بدھو کو ٹیلے پر چڑھتے دیکھ کر کہا۔
سکھدیو نے بدھو کا نام سُن کر آنکھیں کھولیں۔ بدھو بھاگتا ہُوا اس کے قریب پہنچا اور بھیا! بھیا!! کہتا ہُوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سکھدیو کچھ کہے بغیر بدھو کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ بدھو جو آج تک سکھدیو کو رعب و جلال اور صبر و استقلال کا مجسّمہ سمجھتا آیا تھا اس کی افسردہ اور مغموم نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:
"بھیا! تم فکر نہ کرو۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ میں رامو کو موت کے گھاٹ اتار آیا ہوں۔ اب ہمارا کوئی دشمن نہیں۔ بھیا! بھیا!! سکھدیو بھیا! میں تمہارا بدھو ہوں"
سکھدیو کے چہرے پر ایک دردناک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بدھو سے نگاہ ہٹا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ستارے آہستہ آہستہ صبح کی روشنی میں رُوپوش ہو رہے تھے۔ چاند کی روشنی بتدریج ماند پڑ رہی تھی۔ سکھدیو کی بے جان رگوں میں اچانک ایک ارتعاش پیدا ہُوا اس کے ہاتھ پاؤں ہلنے لگے۔ آنکھوں میں ایک خوفناک چمک آ گئی اس نے بے قراری کی حالت میں تیزی سے سانس لیتے ہوئے کنول، بدھو، شانتا اور مادھو کی طرف دیکھا۔ "کنول! کنول!! کنول!!!" کہتے ہوئے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے۔
پھر ایک لمبی سانس کے بعد سکھدیو کی زندگی کا ٹمٹماتا ہُوا چراغ بُجھ گیا۔
کنول، بدھو اور بچّوں کی موجودگی کا احساس کیے بغیر دیوانہ وار اس کی آنکھوں اس کے ہونٹوں اور اس کی پیشانی کو چُوم رہی تھی۔

دوسرا حصہ

"اُس کے سامنے آزادی اور مسرّت کی وہ دنیا تھی جہاں پانی میں لہریں اٹھتی تھیں، پھول کِھلتے تھے، درخت جھومتے تھے، جہاں زندگی اپنی تمام دل فریبیوں کے ساتھ موجود تھی . . . . . اس نے بے بسی کی حالت میں آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"بھگوان! تُو نے اسے شودر کیوں بنایا ہے — اور اگر اسے شودر بنایا تھا تو مجھے اونچی ذات میں کیوں پیدا کیا —؟"

اپنا دیس

چند دن اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد کنول کو دریائے بیاس دکھائی دیا اور پانچ دن دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد وہ دوسرے کنارے پر اپنے آبائی وطن کی ان سرسبز پہاڑیوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک طویل مدت کے لیے تہذیب اور جہالت کے درمیان حدّ فاصل کا کام دے چکی تھیں جن کی بدولت کئی برس تک آزاد قبائل کے جھونپڑے برہمنی سماج کی آتشِ انتقام سے محفوظ رہے تھے۔

راوی سے بیاس تک سفر کے دوران کنول کئی بستیاں اور شہر دیکھ چکی تھی وہ شہر جہاں اونچے ایوانوں میں سماج کے مقدس بیٹوں کی عظمت کے جھنڈے لہراتے تھے — وہ بستیاں جو شودروں کی کمتری اور بے بسی کا اعتراف کرتی تھیں —

شہروں میں بسنے والے انسانوں کے متعلق کنول بہت کچھ جانتی تھی۔ بدھو کچھ تو کنول اور سکھدیو کے ساتھ رہ کر اور کچھ رامو کی داستانیں سن کر اس بات پر ایمان لا چکا تھا کہ انسانیت کی تمام برائیاں ان اونچے ایوانوں میں پرورش پاتی ہیں چنانچہ جب اسے کوئی شہر دکھائی دیتا تو وہ کنول سے مشورہ لیے بغیر اپنا راستہ تبدیل کر دیتا۔

سفر کے شروع میں وہ بستی کو اپنے ہم جنسوں کا مسکن خیال کرتا تھا،

لیکن پہلی ہی منزل میں اسے معلوم ہو گیا کہ شہروں کی وبا بستیوں میں بھی آچکی ہے۔

ایک شام یہ لوگ ایک گاؤں کے قریب پہنچے۔ بدھو نے گدھوں سے سامان اتارا اور بچوں کو کنول کی حفاظت میں چھوڑ کر گاؤں سے آگ لینے چلا گیا۔ اس گاؤں میں اسے سرکنڈے کی جھونپڑیوں کی بجائے خوبصورت مکان دکھائی دیئے۔ اچانک ایک مکان سے جس کا دروازہ کھلا تھا اسے ناقوس اور گھنٹیوں کی صدا آئی۔ بدھو نے پریشانی کی حالت میں جھانک کر اندر دیکھا۔ دیئے کی روشنی میں اسے ایک سیاہ پتھر کی مورتی دکھائی۔ بدھو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس نے کنول کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا "میں بھی حیران تھا کہ یہاں ایسے مکان کہاں سے آگئے۔ چلو بہن! یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو مصیبت آجاتی۔"

بدھو نے جلدی سے گدھوں پر سامان لادا اور گاؤں سے ایک کوس دور جا کر دم لیا۔

اس کے بعد بدھو کسی بستی میں داخل ہونے سے پہلے مٹی کے مکانوں اور گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں اچھی طرح تمیز کر لیتا۔

شودر، بدھو اور کنول کو غریب الوطن سمجھ کر نہایت اخلاص سے پیش آتے۔ آگ کی بجائے ان کو پکا پکایا کھانا دینے پر اصرار کرتے۔ انہیں بستی سے باہر ٹھہرنے کی بجائے اپنے گھروں میں ٹھہرنے پر مجبور کرتے۔ بدھو کو ان کی یہ تمام باتیں پسند تھیں لیکن رات کے وقت ان کے منہ سے دیویوں اور دیوتاؤں کے عجیب و غریب قصے سن کر وہ گھبرا اٹھتا۔ رامو کے دیوتا کی مہیب اور سکھدیو کی مظلوم شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ وہ رات بھر خوفناک سپنے دیکھتا۔ چند دن کے سفر کے بعد وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آئندہ

کسی شودر کے ہاں نہیں ٹھہرے گا۔

بعض اوقات وہ چلتے چلتے پریشان ہو کر کنول سے کہتا "مجھے ڈر ہے کہیں ان لوگوں میں بھی دیوتاؤں کا مرض نہ پہنچ چکا ہو۔"

بدھو کی طرف سے اس قسم کے خدشات کا اظہار کبھی کبھی کنول کو بھی پریشان کر دیتا اور وہ اپنے دل سے یہ سوالات پوچھنے پر مجبور ہو جاتی۔ میں کہاں جا رہی ہوں۔ کیوں جا رہی ہوں۔ وہاں میرے لیے کیا ہو گا؟ لیکن تھوڑی دیر بعد اس پر ایک بے حسی طاری ہو جاتی اور بدھو محسوس کرتا کہ کنول نیم بیداری کی حالت میں کروٹ بدلنے کے بعد پھر گہری نیند سو گئی ہے۔ اگر بدھو کوئی بات بار بار دہراتا تو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوتیں اور ان کی رہی سہی چمک آنسوؤں کے پردوں میں چھپ کر رہ جاتی۔

کنول پر وہ محویت طاری ہو چکی تھی جو کسی انسان میں مایوسی اور بے بسی کی انتہا دیکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے — جو ایک جیتے جاگتے انسان کو پتھر کا مجسمہ بنا دیتی ہے۔ ایک اضطراب مسلسل اس کے لیے ایک دائمی سکون بن چکا تھا۔ اس کے دل میں جو غم کے سمندر کی آخری گہرائیوں میں غوطے کھا رہا تھا، زندگی کے ادنیٰ تفکرات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

بدھو بار بار اسے گدھے پر سوار کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ پیدل چلنے پر اصرار کرتی۔ منزلِ مقصود کی طرف اس کے پاؤں کبھی ڈھیلے اور کبھی تیز اٹھتے لیکن وہ رک جانے پر قادر نہ تھی۔

(۲)

انتہائی مایوسی کبھی کبھی انسان کو ناممکنات کا قائل بنا دیتی ہے۔ صحرا میں پیاسے سراب کی حقیقتوں سے واقف ہونے کے باوجود اسے دریا سمجھ کر اس کی طرف بھاگتے ہیں۔ لُٹا ہُوا سوداگر ہر تاریک غار میں جواہرات کے انبار دیکھتا ہے۔ کنول ماضی کو ایک خواب سمجھ کر اس کی تعبیریں سوچتی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ سکھدیو مرا نہیں۔ میں نے شاید یہ تمام واقعات خواب کی حالت میں دیکھے ہیں لیکن اپنے ساتھ مادھو، شانتا اور بدھو کو دیکھ کر وہ اضطراری حالت میں اکثر یہ پوچھ بیٹھتی ”بھیّا! وہ واقعی مر چکے ہیں؟“

بدھو ایک لمحے کے لیے مڑ کر مایوسی اور حسرت کے اس مجسّمے کی طرف دیکھتا اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کو بھینچ کر آواز کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ”کنول بہن! اب ہم صبر کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں؟“

کنول کی طرح بدھو کے لیے بھی سکھدیو کی موت نے زندگی کا مفہوم بدل دیا تھا۔ سورج ہر صبح اپنی پرانی آب و تاب کے ساتھ نکلتا۔ ستارے ہر شام نمودار ہوتے۔ چاند ہر رات اپنی شکلیں بدلتا۔ درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ فضا میں پرندے اسی طرح اُڑتے تھے ــــ بیاس کی لہریں راوی کی لہروں سے مختلف نہ تھیں لیکن بدھو یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی کائنات میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو اب پُر نہیں ہو سکتا۔

سازِ ہستی کا وہ تار جس کی ہر جنبش کے ساتھ بدھو کی سادہ اور معصوم زندگی کی مسرتیں رقص کرتی تھیں ٹوٹ چکا تھا۔ اس شخص کی طرح جسے ہاتھ پاؤں باندھ کر گہرے پانی میں پھینک دیا گیا ہو، بدھو کو اپنا دم گھٹتا ہُوا محسوس ہوتا۔ انتہائی

کرب کی حالت میں وہ چیخیں مار کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا لیکن وہ طوفان جو دل سے دردناک چیخیں بن کر اٹھتا ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے ہلکی ہلکی آہوں اور سسکیوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتا۔ بعض اوقات کنول اور بچوں کا خیال اسے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیتا اور آگ کے وہ شعلے جو دل سے اٹھتے پانی میں تبدیل ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ نکلتے۔ آسمان کے ستاروں کے سوا جنھوں نے بار بار بدھو کی چھلکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تھا اور خاک کے ان ذروں کے سوا جن میں بارہا اس نے اشکوں کے موتی لُٹائے تھے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس چھوٹی سی دنیا میں کیا کیا طوفان اٹھتے ہیں۔

کنول کے کان اس کی آہوں اور اس کی نگاہیں اس کے آنسوؤں سے آشنا تھیں۔ اس کے خیال میں بدھو ایک مرد تھا ایک ایسا مرد جو زندگی کے ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ صرف ایک رات جب وہ دریا کے کنارے سو رہے تھے اور کنول حسبِ معمول لیٹے لیٹے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے بدھو کو جو اس کے قریب منہ کے بل ریت پر لیٹا ہُوا تھا یہ کہتے ہوئے سنا بھیّا! تم کہاں ہو؟ اس کے بعد بدھو دیر تک ہچکیاں لیتا رہا۔

کنول کو پہلی بار یہ محسوس ہُوا کہ وہ آہوں اور آنسوؤں کی دنیا میں اکیلی نہیں اس نے کہا: ”بھیّا! تم رو رہے ہو؟“

بدھو نے کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا اور کہا: ”بہن تم جاگ رہی تھیں؟“

”سونا اب میرے بس کی بات نہیں؟“

بدھو نے ذرا سنبھل کر کہا: ”بہن! ماہی گیر کہتے تھے کہ تمہارا گاؤں ایک شہر بن چکا ہے اور وہاں راجہ کے سپاہیوں کی حکومت ہے۔ ہمیں شہر کے اندر

جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"بھیا! ہم شہر سے باہر جھونپڑی بنا لیں گے۔"

"لیکن وہاں جا کر اگر شہر سے باہر جھونپڑی بنانی ہے تو یہیں ان ماہی گیروں کے پاس کیوں نہ رہیں۔ یہ لوگ اگر دیوتاؤں کے متعلق اتنی باتیں نہ کریں تو برے نہیں۔"

"بھیا! یہ تمہارے بھائی کی آخری خواہش تھی۔"

"لیکن انہیں یہ تو معلوم نہ تھا کہ دیوتاؤں کے پجاری وہاں قدم جما چکے ہیں۔ بہن! مجھے اپنا نہیں ان بچوں کا خیال ہے۔"

"بھیا ایسی باتیں نہ کرو۔ آخر میری قوم کے اور لوگ بھی تو اس جگہ رہتے ہیں۔"

"بہن! تمہاری مرضی۔ لیکن میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ کوئی مادھو اور شانتا سے دیوتاؤں کے متعلق باتیں کرے اس بارے میں تمہاری قوم کے لوگوں کے پاس رہنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ ہماری جھونپڑی سب سے علیحدہ ہوگی۔"

"بھیا! میں خود کسی کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔"

---

(۲۳)

صبح کا ستارہ آفتاب کی آمد کا پیغام دے رہا تھا۔ ماہتاب کے گرد نور کی موجوں کا دائرہ محدود ہو رہا تھا۔ تاروں کے قہقہے مغموم مسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے رات بھر فضا میں اڑنے والے جگنو گھاس میں چھپ رہے تھے۔ آس پاس کے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

مشرق کے بلند پہاڑوں کے عقب سے سرخ روشنی کی شعاعیں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور شب کی سیاہ چادر مغرب کی طرف سمٹ رہی تھی۔ سورج

جو آگ کے انگارے کی طرح سرخ اور اپنی ضخامت سے کئی گنا بڑا نظر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی پر نمودار ہوا اور اس کی سرخ کرنوں کی بدولت بیاس کے شفاف پانی میں خون کی آمیزش نظر آنے لگی پھر سورج کے سرخ چہرے پر پگھلے ہوئے لوہے کی سی سفیدی اور چمک پیدا ہونے لگی۔ اس کی ضخامت کم ہوتی گئی اور درختوں کے طویل اور دھندلے سائے گھٹنے لگے۔ آس پاس کی جھاڑیوں میں مکڑی کے جالوں اور گھاس کی پتیوں پر شبنم کے قطرے رنگ رنگ کے بیش قیمت موتی نظر آتے تھے۔

کنول حسبِ معمول سب سے پہلے بیدار ہو کر بکریوں کا دودھ دوہ رہی تھی مادھو اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور شانتا لیٹے لیٹے آنکھیں مل رہی تھی۔ بدھو دیر تک جاگنے کے بعد اب گہری نیند سو رہا تھا۔ کنول دودھ دوہ کر اٹھی اور مادھو کی طرف دیکھ کر بولی "بیٹا! اٹھ کر نہا لو۔ اپنے چچا کو بھی جگا دو۔"

چچا کے لفظ پر شانتا چونک کر اٹھی اور مادھو ابھی اٹھ کر جمائی لے ہی رہا تھا کہ اس نے بھاگ کر بدھو کو جا جگایا۔

بدھو نے ایک دو بار آنکھیں کھول کر پھر سو جانے کی کوشش کی لیکن شانتا کے بار بار جھنجھوڑنے پر اٹھ کر انگڑائیاں لینے لگا۔

کنول نے کہا "بھیا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

اس نے جواب دیا "جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

کنول نے کہا: "مچھیرے ابھی تک نہیں آئے۔"

بدھو نے دریا کے کنارے تین چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی طرف دیکھا اور کہا "وہ آتے ہی ہوں گے۔"

مادھو نے جنوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ماتا! ادھر دیکھو! وہ آ رہے ہیں۔"

کنول، بدھوا اور شانتا پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ کوئی پانچ سو قدم پر ایک چھوٹی سی بستی سے چند ماہی گیر دریا کی طرف آ رہے تھے۔

بدھو نے کہا "میں جلدی سے نہا لوں۔ آؤ مادھو!"

بدھوا اور مادھو نے بھاگ کر دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ تھوڑی دیر تیرنے اور چند بار غوطے لگانے کے بعد وہ دونوں دریا سے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں ماہی گیر کنول کے قریب پہنچ چکے تھے۔

ایک ماہی گیر نے جو دوسروں کی نسبت عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا کنول کے سامنے بانس کی ایک چھوٹی سی ٹوکری رکھ دی اور کہا "ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے ہماری بستی میں ٹھہرنا پسند نہ کیا۔ اب جو کچھ ہم کھاتے ہیں آپ کے لیے لائے ہیں آپ تھوڑا بہت کھا لیں۔ ہم آپ کو ابھی پار پہنچا دیتے ہیں۔"

"آپ نے بہت تکلیف کی" یہ کہہ کر کنول نے ٹوکری کے اوپر سے بڑ کے پتے اٹھائے تو نیچے چند روٹیاں اور مٹی کا ایک کٹورا مکھن سے بھرا ہوا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد یہ مسافر اپنی بھیڑوں، بکریوں اور گدھوں سمیت کشتیوں میں سوار ہوئے۔ دریا کا بہاؤ اگرچہ تیز تھا لیکن اس کی موجوں میں برسات کے ابتدائی ایام کی سرکشی نہ تھی۔ منجدھار میں ایک تیز لہر کشتیوں کو چند قدم نیچے کی طرف لے گئی لیکن ملاحوں نے جلد ہی ان کی رفتار پر قابو پا لیا اور تینوں کشتیاں کنارے پہنچ گئیں۔

کنول نے ملاحوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ایک بکری دینے کی کوشش کی لیکن انہوں نے بیوہ کا مال لینے سے انکار کر دیا۔ ملاحوں کی جماعت کے دو آدمی آخری منزل تک کنول کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن بدھو ہر اجنبی سے مراسم بڑھانے کے خلاف تھا اس نے کہا آپ نے ہمارے لیے پہلے ہی بہت تکلیف اٹھائی ہے اب ہماری منزل دور نہیں۔ ہم شام تک وہاں پہنچ جائیں گے۔

ایک ملاح نے پوچھا "آپ کہاں جائیں گے؟"

مادھو نے پریشان ہو کر کنول کی طرف دیکھا اور اس نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "وہاں پہاڑی کے پیچھے جوبن پور"

ایک بوڑھے ملاح نے حیران ہو کر کہا "جوبن پور تو مدت ہوئی اجڑ چکا ہے۔ اب وہاں اونچی ذات والوں کا شہر آباد ہے۔ شاید اس شہر کے آس پاس اچھوتوں کی جو بستیاں ہیں ان میں سے کسی کا نام جوبن پور ہو۔ میں نے سنا ہے کہ شہر کا سردار بہت اچھا آدمی ہے اور ہماری قوم کے آدمیوں پر جو شہر کے نزدیک بستیوں میں رہتے ہیں کوئی ظلم نہیں کرتا۔ انہیں ہماری طرح صرف شہر کے مندروں اور کنوؤں پر جانے کی اجازت نہیں ورنہ وہ ہر طرح آزاد ہیں۔ شروع شروع میں ان لوگوں پر بہت ظلم ہوتا تھا ـــ راجہ کا سیناپتی گنگا رام اور اس کا بھائی جے رام بہت ظالم تھے۔"

گنگا رام کا نام سن کر کنول کو تصور میں چاروں طرف خون کی ندیاں اور آگ کے شعلے دکھائی دینے لگے۔ اسے جلتے ہوئے جھونپڑوں کے درمیان اپنا باپ خاک و خون میں تڑپتا دکھائی دیا۔ بیواؤں اور یتیموں کی چیخ پکار سنائی دی۔ سماج کے باغیوں کے خلاف سردار کی بیٹی کے دل میں انتقام کی دبی ہوئی چنگاریاں سلگ اٹھیں لیکن ان مہیب مناظر کے درمیان سکھدیو کی صورت دکھائی دی اور آگ کے شعلے اور تڑپتی ہوئی لاشیں آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں سے اوجھل اور زخمیوں کی چیخ پکار کا شور اس کے کانوں سے محو ہوتا گیا۔ وہ صرف سکھدیو کو دیکھ رہی تھی اس کی پیاری اور میٹھی دلکش آواز سن رہی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

بدھو دیر تک ملاحوں سے باتیں کرتا رہا واپس لوٹتے وقت انہوں نے

کنول سے رسمی الوداع کی خواہش ظاہر کی لیکن بدھو نے اشارے سے منع کر دیا۔

ملاح اپنی اپنی کشتیوں پر بیٹھ کر چل دیئے۔ بدھو کچھ دیر خاموش کھڑا دریا کی طرف دیکھتا رہا۔ شانتا اور مادھو بھی ایسے موقعوں پر خاموش رہنا سیکھ چکے تھے۔ اور وہ حیران ہو کر بدھو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بالآخر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہُوا کنول کے قریب پہنچا۔

"بہن! بہن کنول!" اس نے معصوم آواز میں کہا۔

کنول سر اٹھا کر بدھو کی طرف متوجہ ہوئی۔ سردار کی بیٹی کے دل میں انتقام کی چنگاریاں غم کے آنسوؤں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

بدھو نے کہا "بہن کنول! ہم وہاں نہیں جائیں گے۔"

کنول نے ملتجی نگاہوں سے بدھو کی طرف دیکھا اور کہا: "بھیا! صرف ایک بار مجھے وہاں لے چلو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ وہاں ٹھہرنے کے لیے ضد نہیں کروں گی میں صرف دُور سے اپنا اجڑا ہُوا گھر دیکھ کر واپس چلی آؤں گی۔ اور بھیا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی قوم کے دوسرے آدمیوں کی طرح ہمیں شہر کے آس پاس رہنے کیلئے کوئی جگہ مل جائے؟"

بدھو نے جواب دیا کہ "اگر راجہ کے آدمیوں کو یہ علم ہو گیا کہ تم سردار کی لڑکی ہو تو پھر ان بچّوں کا کیا حال ہو گا؟"

"نہیں بھیا! اب مجھے کون پہچانے گا۔ ان ملاحوں میں ایک ہماری بستی کا آدمی تھا اسے میرے متعلق شک بھی نہیں ہوا۔ اب تو اگر تمہارا بھائی بھی آ کر مجھے اس حال میں دیکھے تو وہ بھی شاید پہچان نہ سکے۔"

بدھو نے کہا "اچھا بہن! جیسے تمہاری مرضی۔ جوبن پور اب کتنی دور ہو گا؟"

"اس ٹیلے سے پرے یہاں سے کوئی تین کوس۔"

"تو پھر دوپہر یہیں گزار لیتے ہیں۔" بدھو نے کہا۔

مادھو نے کہا "آؤ چچا! دریا میں نہائیں!"

بدھو نے کہا "نہیں! نہیں!! اس کنارے پانی تیز ہے۔" لیکن مادھو نے پورا فقرہ سننے سے پہلے بھاگ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

"بے وقوف! کنارے سے دُور نہ جانا!" یہ کہہ کر بدھو بھی پانی میں کود پڑا۔ مادھو نے ہنستے ہوئے غوطہ لگا دیا۔

---

(۴)

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے یہ قافلہ ایک ٹیلے پر چڑھ رہا تھا۔ کنول سب سے آگے تھی۔ شانتا ایک گدھے پر سوار تھی اور بدھو اور مادھو سب سے پیچھے مویشیوں کو ہانک رہے تھے۔

دل کی دھڑکن کے ساتھ کنول کی رفتار کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھی اس کی زندگی کے ہر افق پر تاریک گھٹاؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مایوسی ایک ناقابلِ تردید حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ولولوں، حوصلوں اور امنگوں کی دنیا اُجڑ چکی تھی — امید کا ہر نخلستان یاس کے صحرا کی بھیانک وسعتوں نے چھپا لیا تھا۔ تاہم ایک وہم — ایک جنون جو ایک انسان کے دل میں عقل و شعور کے اعترافِ شکست کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اسے ہر ٹھوکر کے بعد اُٹھنے اور اٹھ کر آگے بڑھنے کا سہارا دے رہا تھا۔

توہمات کے حسین پردوں میں حقیقت کا بھیانک چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی وہ اپنے ماحول کی تاریکی میں عقل و شعور کی مشعل کا سہارا چھوڑ کر موہوم

امیدوں کی چراغ روشن کر رہی تھی۔ ایک فریب خوردہ بچے کی طرح وہ تمام دنیا کو جھٹلا رہی تھی۔ کبھی کبھی ماضی کے تمام واقعات اسے وہم نظر آتے اور وہ اپنے دل کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی کہ اس کے آباؤ اجداد کی بستی اُجڑی نہیں بلکہ اسی طرح آباد ہے۔ سکھدیو زندہ ہے اور بستی کے باہر جھیل کے کنارے اس کا انتظار کر رہا ہے وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کر اس سے لپٹ جائے گا اور پوچھے گا: "کنول! تم کہاں تھیں؟" وہ یہ کہے گی "سکھدیو! تم نے مجھے بہت رُلایا" اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ اس کے پاؤں کی رفتار بھی تیز ہو جاتی لیکن موہوم امیدوں کے چراغ کچھ دیر ٹمٹمانے کے بعد بُجھ جاتے اس کا رہا سہا شعور اپنے بے رحم ہاتھوں سے حقیقتوں کے منحوس چہرے سے توہمات کے حسین نقاب اٹھا دیتا۔ اس کے دل کی دھڑکن مدھم اور پاؤں کی رفتار سُست پڑ جاتی۔

لیکن اس کے دل میں پھر ایک نیا ردّعمل شروع ہوتا اور وہ وہم اور شعور کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ ایک نیا دنیا پیدا کرتی اور اپنے دل سے کہتی کہ وہ مر چکے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مُردے پھر زندہ ہو چکے ہوں۔ سکھدیو اس کی تلاش میں کسی دوسرے راستے جوبن پور پہنچ چکا ہو اور اس کے باپ کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہو۔ اس کی قوم کے مُردوں نے زندہ ہو کر اس کے آباؤ اجداد کی سرزمین سے سماج کے حملہ آوروں کو مار بھگایا ہو اور اونچی ذات والوں کے محلات پھر شودروں کے جھونپڑوں میں تبدیل ہو چکے ہوں؟

- سورج کی شعاعوں کا جال مغرب کی طرف سمٹ رہا تھا۔ اُفق پر مٹیالے رنگ کے بادل کا ایک ٹکڑا بتدریج سرخ ہو رہا تھا مشرق کی طرف کانگڑہ کے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی ہوئی برف سونے کے انبار نظر آنے لگی اور شفق کی بڑھتی ہوئی سرخی کی بدولت یہ سنہری انبار یاقوت کے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔

کنول پہاڑی کی چوٹی پر کھڑی اپنے بدلے ہوئے گھر کا نقشہ دیکھ رہی تھی آس پاس کے ٹیلے اور ان پر درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ دریا اسی طرح بہہ رہا تھا۔ نیچے جھیل کے پُرسکون اور شفاف پانی میں درختوں کے سائے اسی طرح نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ چھوٹی سی بستی جس کا تصوّر کنول کے لیے ان مناظر سے کہیں زیادہ دل فریب تھا اب ایک خوش نما شہر بن چکی تھی۔ کنول اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر اس عالی شان محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس کی بنیاد کے نیچے اس کے آباؤ اجداد کے گھر کی راکھ دفن تھی۔ شہر کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ سماج کے باغیوں میں سے بعض پُرامن شودر بن چکے ہیں۔"

مایوسی اور بے کسی کے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں غوطہ لگانے کے بعد اپنے دل سے کنول کا پہلا سوال یہ تھا "میں یہاں کیوں آئی؟" اس نے بدھو، مادھو اور شانتا کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ کنول نے اپنے چہرے کو پھٹی ہوئی چادر میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شانتا گھبرا کر ماں کے ساتھ لپٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔ مادھو ایسے موقعوں پر بدھو کی تقلید کرنے کا عادی تھا لیکن اس دفعہ وہ بھی زیادہ دیر ضبط سے کام نہ لے سکا اور آنسو بہانے لگا۔ بچوں کو روتا دیکھ کر ممتا کنول کی تمام حسیات پر غالب آ گئی۔ اس نے آنسو پونچھے۔ بچوں کو یکے بعد دیگرے گلے لگایا اور بدھو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی: "بھیا چلو!"

بدھو نے کہا "اب کہاں جائیں بہن؟"

"چلو اس شہر کے باہر کہیں ہم بھی ڈیرہ جما لیں گے۔ اب رات ہو رہی ہے اگر تم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا تو کل کہیں اور چلے جائیں گے۔"

مادھو نے کہا "چچّا! چلو، مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

ٹیلے سے نیچے اترنے کے بعد اچھوتوں کی ایک چھوٹی سی بستی کے کتّوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس قافلے کا خیر مقدم کیا۔ چند مرد، عورتیں اور بچّے کتّوں کی چیخ پکار سن کر گھروں سے نکلے اور بدھو اور کنول سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے "کہاں سے آئے ہو؟ — کون ہو — ؟ کہاں جا رہے ہو؟ رات یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے؟"

کنول خاموش تھی۔ بدھو نے بھی کسی سوال کا جواب نہ دیا اور گدھوں کو ہانکتا اور کتّوں کو گالیاں دیتا ہوا بستی سے باہر نکل آیا۔ کنول کی خواہش پر اس نے جھیل کے قریب چند گھنے درختوں کے درمیان گدھے روک لیے اور سامان اتارنے لگا۔

---

(۵)

آدھی رات کے وقت بدھو، شانتا اور مادھو شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر پھٹے پرانے بستر بچھاتے گہری نیند سو رہے تھے۔ کنول کئی بار کروٹیں بدل کر سونے کی ناکام کوشش کے بعد آسمان کے جگمگاتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔ مشرق میں ایک ٹیلے کے عقب سے چاند نمودار ہوا اور ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ کنول کو اچانک ایک خیال آیا اور وہ اٹھ کر جھیل کی طرف چل دی۔

جھیل میں جا بجا کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے چمکتے ہوئے جگنو فضا میں رقص کر رہے تھے۔ کنول اپنی ابتدائی زندگی میں ہزاروں بار یہ مناظر دیکھ چکی تھی لیکن اب ان میں وہ دل کشی نام کو نہ تھی۔ بچپن میں وہ ان تمام چیزوں کو اپنی زندگی کا ایک جزو خیال کرتی تھی۔ جگنوؤں کے پیچھے بھاگنے اور کنول کے پھولوں کو توڑ کر ان کی پتیاں

بکھیرنے میں ایک لطف آتا تھا وہ ٹیلوں اور وادیوں میں گھومتے اور جھیل میں تیرتے ہوئے خوش ہوتی تھی — پھر سکھدیو آیا اور اس نے کنول کے زمین و آسمان میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔ اور اسے دنیا کی ہر حسین شے سکھدیو کی کسی نہ کسی خوبی کا مظہر نظر آنے لگی۔ اسے پہاڑوں میں سکھدیو کی عظمت، چاند میں اس کی دل فریبی، سورج میں اس کا جاہ و جلال۔ ستاروں میں اس کی مسکراہٹیں اور کنول کے پھولوں میں اس کی پاکیزگی نظر آتی۔ لیکن سکھدیو کی موت کے بعد قدرت کا حسین چہرہ اس کی نگاہوں میں مسخ ہو چکا تھا اور زندگی کے میٹھے راگ تلخ ہو چکے تھے۔

کنول جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ ایک ٹیلے کے قریب اسے آم کے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا وہ رکی، جھجکی اور پھر بھاگ کر ایک درخت کے ساتھ لپٹ گئی۔ یہ ان آموں کی بوئی ہوئی گٹھلیاں تھیں جنہیں سکھدیو نے کھایا تھا۔

کنول نے درد بھری آواز میں کہا "سکھدیو! ہماری محبت کے پودے اب تناور درخت بن چکے ہیں۔ سکھدیو! تم کہاں ہو؟" خاموش کائنات کنول کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی اور وہ خیالات کی دنیا میں کھو گئی۔ سکھدیو اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ چارپائی پر پڑے ہوئے آموں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ "کھانے کی چیز کھا لینے میں کیا ہرج ہے۔ آپ شاید پرسوں تک دریا عبور نہ کر سکیں ... شاید چند دن اور یہیں رہیں اتنے دن بغیر کچھ کھائے ..." اور پھر جب وہ اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں میں سے گھاس اکھاڑ رہی تھی وہ ٹیلے سے اتر کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ کنول دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہی تھی "یہ آم اس دن آپ نے کھائے تھے۔ میں نے گٹھلیاں لا کر اس جگہ بو دیں۔ یہ تمام اُگ آئی ہیں۔"

اچانک آم کے درخت پر سے الّو کی خوفناک آواز سنائی دی اور کنول کے تصورات کی حسین دنیا درہم برہم ہو گئی اسے بچوں کا خیال آیا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی واپس چل دی۔

علی الصباح جب بدھو اٹھ کر جھیل میں نہانے کا ارادہ کر رہا تھا اسے کنول کی آواز سنائی دی۔ وہ بچوں کے قریب لیٹی ہوئی گہری نیند میں کہہ رہی تھی میں یہیں رہوں گی۔ یہ میرا وطن ہے۔ میرے بچوں کا وطن ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔ یہیں رہوں گی۔"

بدھو کچھ دیر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا سوچتا رہا بالآخر وہ انگڑائی لے کر اٹھا اور مادھو کو جھنجھوڑ کر جگانے لگا۔ مادھو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔

بدھو نے کہا "چلو نہائیں۔"

نہانے کی دعوت پر مادھو کی تمام سستی کافور ہو گئی اور وہ خوشی سے اچھلتا، کودتا بدھو کے آگے آگے چل دیا۔

بدھو نے کہا "پہلے کون پہنچے گا؟"

مادھو "میں میں" کہتا ہوا، ہنستا ہوا بھاگا اور جھیل میں کود کر غوطے لگانے لگا۔

اسی دن بدھو پڑوس کے شودروں کی مدد سے سرکنڈے کا جھونپڑا تعمیر کر رہا تھا۔ شودروں کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ شہر والے آدھ کوس کے فاصلے کو دھرم کی حفاظت کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے شہر کا بڑا مندر تھا لیکن شہر کی طرح یہ مندر بھی کافی فاصلے پر تھا۔ بدھو کو شودروں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس شہر کا سردار راجہ کے دوسرے سرداروں سے بہت مختلف ہے اگر اسے معلوم ہو جائے کہ کسی راجہ کے کسی سپاہی نے کسی شودر کے ساتھ بلاوجہ سختی کی ہے تو وہ اسے سخت سزا دیتا ہے۔

دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ وقت کا مرہم اگرچہ کنول کے نہ مٹنے والے زخموں کا مداوا نہ بن سکا۔ تاہم درد کی شدت آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ مرنے والے شوہر کی محبت اس کی زندہ نشانیوں کی طرف منعطف ہونے لگی۔ بیوہ کی مایوسیاں ایک ماں کی امنگوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ بدھو کا دن، بھیڑوں اور بکریوں کے پیچھے گھٹتے اور بڑھتے ہوئے سائے ناپنے میں گزر جاتا وہ شام کو تھکا ہوا آتا اور کھانا کھا کر سو جاتا۔ اور اگر مادھو اور شانتا اصرار کرتے تو چڑیلوں اور بھوتوں کی کوئی کہانی سنانے بیٹھ جاتا۔ آس پاس کی بستیوں کے چرواہوں سے وہ سماج کے دیوتاؤں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ لیکن دیوتا کے معنی اس کے لیے مٹی کی ایک بھیانک مورتی کے سوا کچھ نہ تھے۔ پہاڑی قوم کے ہر چرواہے کی زبان سے دیوتا کا لفظ سن کر وہ یہی سمجھتا کہ کوئی راموا اسے بے وقوف بنا چکا ہے۔

دس مہینوں میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ برسات کا پہلا مہینہ مادھو اور شانتا کے لیے انتہائی مسرت کا مہینہ تھا۔ وہ دن بھر جھیل میں نہاتے اور شام کے وقت کسی ٹیلے پر چڑھ کر دریا کی روانی کا منظر دیکھتے۔

ننھے پجاری

رات بھر بارش ہونے کی وجہ سے صبح کے وقت ہلکی ہلکی بدلیاں ایک لٹے ہوئے قافلے کی طرح منتشر ہو کر مغرب کا رُخ کر رہی تھیں۔ دُور سے مندر کی گھنٹی کی آواز آ رہی تھی۔ پتھر کے ایک مکان کے کشادہ صحن میں آم کے ایک درخت کے نیچے چند گائیں کھڑی تھیں۔ برآمدے میں ایک کمسن لڑکی بستر سے انگڑائی لے کر اٹھی اور آنکھیں ملتے ہوئے بولی: ماتا! ماتا!!

"بیٹی! میں دُودھ دوہ رہی ہوں۔"

لڑکی نے صحن میں آ کر پوچھا "ماتا! پتاجی چلے گئے ہے؟"

ماں نے جواب دیا "بیٹی! وہ تو دیر کے مندر جا پہنچے ہوں گے۔"

لڑکی نے بگڑ کر کہا "مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے۔ میں نے رات کے وقت آپ سے کہا نہیں تھا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ ہی جگا دینا۔"

ماں نے دلاسا دیتے ہوئے جواب دیا "بیٹی! وہ بہت سویرے اٹھے تھے اور جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ موہنا کو دن چڑھے ناشتہ کروا کر بھیج دینا۔ اب تم ہاتھ منہ دھو کر دودھ پی لو۔ شاید رندھیر آ جائے اس کے ساتھ چلی جانا۔"

موہنی پانی کا کٹورا سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور ابھی منہ دھونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ رندھیر بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے ہانپتے ہوئے کہا "چلو موہنا! جھیل کی طرف چلیں۔ وہاں سے کنول کے پھول لائیں گے۔ رام۔ سروپ۔ اِندر اور

لچھمی جا چکے ہیں۔"

موہنی کی ماں بولی "دیکھو رندھیر! اگر جانا ہے تو مندر جاؤ ورنہ موہنی کو یہیں رہنے دو۔"

موہنی منہ پہ پانی کے چھینٹے مارتی ہوئی بولی "ماتا! ہم جھیل سے ہوتے ہوئے مندر جائیں گے۔ تمہارے لیے کنول کے پھول لاؤں گی۔"

ماں نے بگڑ کر کہا "بھاڑ میں جائیں تمہارے پھول۔ کہیں پانی میں ڈوب جاؤ گی۔"

"نہیں ماتا! پھول تو رندھیر توڑے گا میں تو پانی کے نزدیک بھی نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا بیٹا رندھیر! اس کا خیال رکھنا۔ لو بیٹی۔ دودھ پی لو۔"

موہنی نے پیتل کا ایک کٹورا اٹھایا اور ماں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ماں نے کٹورا بھر دیا تو وہ دبے پاؤں رندھیر کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی: "لو جلدی کرو!"

"میں پی آیا ہوں۔" رندھیر نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اوں ہوں! یہ پینا پڑے گا ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔"

رندھیر نے مسکراتے ہوئے کٹورا لیا اور دودھ پی کر واپس کر دیا۔ موہنی پھر بھاگ کر ماں کے پاس پہنچی اور کہنے لگی "ماتا! آج دو پیوں گی۔ ماں نے مڑ کر رندھیر کی طرف دیکھا وہ ہنس پڑا اور اس نے مسکراتے ہوئے کٹورا بھر دیا۔ موہنی نے دودھ پی کر کٹورا برآمدے میں رکھ دیا اور رندھیر کے ساتھ چل دی۔ ماں نے پیچھے سے آواز دی "بیٹی! دیر نہ لگانا!"

"نہیں بہت جلد آ جاؤں گی۔"

موہنی اس خیال سے کہ شاید ماں واپس نہ بُلا لے۔ رندھیر کے آگے آگے بھاگنے لگی۔

رندھیر کی عمر قریباً دس سال تھی اور موہنی اس سے دو سال چھوٹی تھی موہنی کی ماں کا نام ساوتری تھا۔ رندھیر اس شہر کے سردار کا لڑکا تھا اور اس کی ماں مر چکی تھی۔

جھیل کے کنارے ان بچوں کے ساتھی ایک اجنبی لڑکی کے پاس کھڑے ایک لڑکے کی طرف دیکھ رہے تھے جو جھیل کے گہرے پانی میں غوطے لگا رہا تھا۔

تیرنے والے لڑکے نے ان سب کو داد طلب نگاہوں سے دیکھ کر کہا:

"شانتا! دیکھو میں نیچے سے مٹی لاتا ہوں۔"

شانتا کو ان بچوں کے صاف ستھرے لباس نے مرعوب کر دیا تھا وہ پریشان ہو کر کنارے کی طرف بڑھی اور کہنے لگی "چلو مادھو! گھر چلیں۔ ماتا انتظار کرتی ہوں گی۔"

"ابھی آیا" مادھو نے یہ کہہ کر غوطہ لگا دیا۔ بچے چند لمحے پریشان کھڑے رہے۔ موہنی دیر تک ضبط نہ کر سکی۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے رندھیر کی طرف دیکھا اور کہنے لگی: "رندھیر! وہ بیچارا ڈوب گیا اسے نکال لاؤ نا!"

رندھیر نے جلدی سے کرتا اتار کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ ابھی گہرے پانی میں نہ پہنچا تھا کہ مادھو نے کنارے کے پاس آ کر سر نکالا اور شانتا کی طرف ایک سیب پھینکتے ہوئے بولا "یہ لو۔"

"آہا سیب!" موہنی نے شانتا کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"تم لو گی؟" شانتا نے یہ کہہ کر سیب اس کی طرف بڑھا دیا۔

موہنی نے سیب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا "وہ تمہارا بھائی

ہے؟"

"ہاں!"

"ہمیں بھی سیب لا دو نا!" لچھمی نے مادھو سے مخاطب ہو کر کہا:

"اچھا! تمہیں بھی لا دیتا ہوں۔"

مادھو نے چند بار پانی میں غوطے لگائے اور ہر ایک کو ایک سیب لا دیا۔

رندھیر نے بھی سیب حاصل کرنے کے لیے چند بار غوطے لگائے لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

مادھو نے پوچھا "تمہیں بھی لا دوں؟"

رندھیر نے جواب دیا "نہیں میں خود نکالوں گا۔"

رام سروپ اور اندر کنارے کے کم گہرے پانی میں اُتر کر کنول کے پھول توڑنے لگے۔ موہنی نے پانی میں اُترنے کی بجائے کنارے سے ہاتھ بڑھا کر ایک پھول توڑنے کی کوشش کی لیکن پاؤں پھسلا اور وہ دھم سے پانی میں گر پڑی۔ باقی تمام بچوں نے قہقہہ لگایا۔ رندھیر اس کی مدد کے لیے بڑھا لیکن وہ اس کے پہنچنے سے پہلے اٹھ بیٹھی اور کچھ دیر منہ بسورنے کے بعد بچوں کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔

مادھو نے گہرے پانی سے کنول کے چند بڑے بڑے پھول توڑے اور جھیل سے باہر نکل کر جھجکتے ہوئے موہنی کو پیش کر دیئے۔

موہنی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے۔ مادھو نے پوچھا "اور لا دوں؟"

موہنی نے جواب دیا "نہیں یہ بہت ہیں۔"

مادھو کو اب بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن ان بچوں کو چھوڑ کر اس کا گھر جانے کو جی نہ چاہا اس نے پھر جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ اور رندھیر کے پاس جا کر کہا:

"میں غوطہ لگاتا ہوں تم پکڑو گے؟"

"ہاں!"

مادھو نے غوطہ لگایا۔ رندھیر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت دُور جا نکلا اس کے بعد رندھیر نے غوطہ لگایا لیکن مادھو نے اسے پکڑ لیا۔ مادھو اور رندھیر دیر تک اس کھیل میں مصروف رہے۔ موہنی نے کئی آوازیں دیں لیکن رندھیر اس نئی دل چسپی میں مندر کی طرف جانے یا گھر لوٹنے کا خیال چھوڑ چکا تھا۔ باقی بچے اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ موہنی رندھیر کی بے توجہی سے تنگ آکر شانتا سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے شانتا کے قریب گھاس پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "تم بھی تیرنا جانتی ہو؟"

"ہاں اور تم؟"

"مجھے گہرے پانی سے ڈر لگتا ہے۔"

شانتا نے پوچھا "تم شہر سے آئی ہو؟"

"ہاں ـــ اور تم؟"

"ہم یہیں رہتے ہیں" جھیل کے کنارے۔"

"تم نے شہر دیکھا ہے؟"

"نہیں! چچا بدھو کہتا ہے شہر کے دیوتا انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔"

"پگلی! وہ تو ہماری حفاظت کرتے ہیں۔"

"بھلا تم نے دیوتا دیکھے ہیں؟"

"میں تو ہر روز دیکھتی ہوں تم بھی دیکھو گی؟"

"کہاں؟"

"مندر میں۔"

"مندر میں؟ میں وہاں نہ جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"پگلی! بھلا لوگ دیوتاؤں سے بھی ڈرا کرتے ہیں؟"

"تمہیں اُن سے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں تو۔"

"اگر وہ تمہیں پکڑ کر کھا جائیں تو؟"

"یہ تمہیں کس نے بتایا کہ دیوتا لوگوں کو کھا جاتے ہیں؟"

"چچا بدھو نے۔"

"وہ کون ہے؟"

"میرا چچا۔"

"وہ کوئی جنگلی ہوگا۔"

"جنگلی کیا ہوتا ہے؟"

"جنگلی وہ ہوتا ہے جس نے شہر نہ دیکھا ہو۔"

"تو پھر ہم سب جنگلی ہیں۔ ہم میں سے کسی نے شہر نہیں دیکھا۔ بھلا شہر کے لوگ جنگل کے لوگوں کو مارتے ہیں؟"

"نہیں تو۔"

شانتا شہر کے متعلق کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن مادھو اور رندھیر نے جھیل سے نکل کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔

مادھو نے رندھیر سے سوال کیا "کل تم یہاں آؤ گے؟"

رندھیر نے جواب دیا "آؤں گا۔"

"تم بنسری بجانا جانتے ہو؟"

"نہیں! ۔۔۔ تم؟"

"میں جانتا ہوں۔ ٹھہرو! میں تمہیں سناتا ہوں۔"

مادھو کا کُرتہ ایک درخت کی ٹہنی کے ساتھ لٹک رہا تھا اس نے آگے بڑھ کر جیب سے بنسری نکالی اور اسے ہونٹوں سے لگا کر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے موہنی اور رندھیر کی طرف دیکھنے لگا۔

موہنی نے کہا "چلو رندھیر! گھر چلیں۔"

مادھو نے اپنا کمال دکھانے کا موقع کھونا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں بنسری پر پھرنے لگیں اور فضا میں بھیرویں کا دل کش نغمہ گونجنے لگا۔

رندھیر اور موہنی کے کان موسیقی کی لطافتوں سے ناآشنا نہ تھے۔ بنسری کی لَے انہیں معمول سے زیادہ خوش گوار معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ بنسری بجانے والا اُن کا ہم عمر تھا۔ وہ ایک دوسرے کے تاثرات کا اندازہ کرنے کے لیے بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ رندھیر کی آنکھیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں۔ دیکھا تم نے گھر جانے کی رٹ لگا رکھی تھی اور موہنی کی نگاہیں اس کا جواب دے رہی تھیں۔ کاش! تم بھی اسی طرح بنسری بجا سکتے۔

مادھو نے یہ نغمہ ختم کیا اور فضا میں خاموشی اور اداسی چھا گئی۔ رندھیر اور موہنی ایک گہری دل چسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

شانتا! درخت کی ٹہنی سے کرتہ اتار لائی اور مادھو کو دیتے ہوئے بولی:

"لو اب کرتہ پہنو! گھر چلیں۔"

رندھیر نے جواب دیا: "ہم کل پھر آئیں گے۔ تم بھی آؤ گے نا؟"

"آؤں گا۔" مادھو نے کُرتہ پہنتے ہوئے کہا۔

رندھیر کپڑے پہن کر موہنی کے ساتھ ہو لیا لیکن چند قدم چل کر واپس مڑا اور مادھو سے پوچھنے لگا۔ "تم کہاں جاؤ گے؟"

"ہم جھیل کے اس طرف رہتے ہیں۔"

"میں کل بنسری لاؤں گا مجھے سکھا دو گے؟"

"سکھا دوں گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مادھو اور تمہارا؟"

"رندھیر۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تمہارا؟ ۔۔۔" مادھو نے موہنی سے پوچھا۔

"میرا نام موہنی ہے۔"

"تم بگلے کے بچے دیکھو گی؟"

"ہاں وہ کہاں ہیں؟"

"تم انہیں مارو گی تو نہیں؟"

"نہیں ماروں گی۔"

"اچھا چلو! تمہیں دکھاتا ہوں۔"

شانتا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اس نے کہا "میں بگلے کے بچے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں گھر جاؤں گی۔"

"اچھا تم جاؤ۔"

شانتا جھونپڑی کی طرف چل دی۔

رندھیر نے کہا: "چلو موہنی! پھر دیکھیں گے۔"

"نہیں! میں ابھی دیکھوں گی۔ جب تم نہا رہے تھے۔ میری بات بھی نہیں سنتے تھے۔ اب میں بگلے کے بچے دیکھنا چاہتی ہوں تو تم بھاگنا چاہتے ہو!"

"اچھا بھئی چلو!"

رندھیر اور موہنی مادھو کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

چند قدم چل کر مادھو ایک درخت کے اوپر چڑھا اور اس نے ایک گھونسلے میں سے بگلے کے دو بچے اتار کر رندھیر اور موہنی کے سامنے رکھ دیئے۔

موہنی نے پوچھا: "یہ چونچ کیوں کھولتے ہیں؟"

مادھو نے جواب دیا: "انہیں بھوک لگ رہی ہے۔"

موہنی نے کہا: "نہیں تم غلط کہتے ہو۔ یہ بھگوان جی کا نام جپتے ہیں۔"

"بھگوان جی! وہ کیا ہوتا ہے؟"

موہنی نے حیران ہو کر جواب دیا "اُوں ہوں، تمہیں بھگوان جی کا پتہ نہیں؟ بھگوان جی نے تو ہمیں بنایا ہے۔"

مادھو نے سوال کیا: "تمہیں بھگوان جی نے بنایا ہے؟"

"ہاں۔"

"اور مجھے؟"

"تمہیں بھی اسی نے بنایا ہے۔"

"اور ان پھولوں کو؟"

"یہ بھی بھگوان جی نے بنائے ہیں۔ پتا جی کہتے تھے کہ سب چیزیں بھگوان جی نے بنائی ہیں۔"

مادھو نے پریشان ہو کر سوال کیا "وہ بھگوان جی کہاں ہے؟"

"تم نے ابھی تک بھگوان جی کو نہیں دیکھا۔"

مادھو نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "نہیں!"

"وہ مندر میں ہیں۔ ہم انہیں ہر روز دیکھا کرتے ہیں۔ تم بھی دیکھو گے؟"

"لیکن چچا بدھو تو یہ کہتا تھا کہ مندر میں شہر کے لوگ بچوں کو کھا جاتے ہیں۔"

"وہ تمہیں یونہی ڈراتا ہو گا۔ چلو رندھیر اسے مندر دکھا لائیں۔"

"لیکن دیر ہو جائے گی۔"

"نہیں ہم جلدی سے لوٹ آئیں گے۔"

---

(۲)

مادھو خوف، تشویش اور تذبذب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ موہنی اور رندھیر کے ساتھ مندر کی طرف چل دیا۔ بدھو نے اسے اور شانتا کو مندر کے متعلق ہزاروں خوفناک باتیں سنائی تھیں لیکن موہنی نے یہ کہہ کر وہ تمہیں ڈراتا ہو گا اس کے اکثر توہمات دور کر دیئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چچا بدھو اسے اکثر ڈرایا کرتا تھا۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو وہ اسے یہ کہہ کر درختوں پر چڑھنے سے منع کیا کرتا تھا کہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں لیکن اب وہ اونچے سے اونچے درخت پر چڑھ سکتا تھا اور کسی چڑیل نے اسے نیچے نہ گرایا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو بدھو جھیل میں جانے سے روکنے کے لیے یہ کہا کرتا تھا کہ وہاں مگرمچھ رہتے ہیں لیکن اب وہ گہرے پانی میں تیرتا ہے اور مگرمچھ اسے کھانے کے لیے نہیں دوڑتے۔ مندر میں اگر کوئی ڈرانے والی چیز ہوتی تو رندھیر اور موہنی کو کیوں نہ ڈراتی۔

مادھو اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ بدھو چچا مجھے درختوں سے اس لیے ڈراتا تھا

کہیں گر نہ پڑوں۔ پانی سے اس لیے ڈراتا تھا کہ میں ڈوب نہ جاؤں اور مندر سے شاید اس لیے ڈراتا ہے کہ میں راستہ نہ بھول جاؤں۔ اور شہر ۔۔۔؟ شہر کے متعلق بھی تو وہ مجھے ڈرایا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ شہر کے متعلق بھی اس نے جھوٹ بولا ہو اگر شہر کے لوگ بچے کھانے والے ہوتے تو رندھیر اور موہنی اور دوسرے بچوں کو کیوں چھوڑتے۔ چچا جھوٹ بولتا ہے۔ آج میں اسے بتاؤں گا کہ میں مندر دیکھ آیا ہوں اور تم شہر کے متعلق بھی جھوٹ بولتے ہو۔

مادھو کا دل خوشی سے اچھلنے لگا لیکن پھر اس کے دل میں ایک خیال آیا وہ بھگوان کیسا ہوگا۔ مندر میں بیٹھ کر یہ سب کچھ کس طرح بناتا ہوگا؟ اس کے دماغ میں بھگوان کی کوئی خیالی تصویر نہ آسکی۔ بہر صورت اسے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ کوئی خوفناک شے نہ ہوگی۔

مندر سے باہر شنکر اور گوپال دو پجاری، آم کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں سو رہے تھے۔ موہنی اور رندھیر کے ساتھ مادھو اپنے دماغ میں بھگوان کی عجیب و غریب خیالی تصویریں لیے مندر میں داخل ہوا۔ مندر کے وسیع کمرے میں طرح طرح کی مورتیاں دیکھ کر ہیبت سی طاری ہو گئی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے" اس نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

موہنی نے اسے تسلی دی اور کہا "ڈر کس بات کا؟ یہ سب اچھے دیوتا ہیں۔"

"دیوتا؟" اس نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "تم تو مجھے بھگوان دکھانے کے لیے لائے تھے وہ جس نے ہمیں بنایا ہے۔"

موہنی نے جواب دیا "وہ دیکھو سب سے اونچے بھگوان جی ہیں آؤ قریب آکر اچھی طرح دیکھو۔ ڈرتے کیوں ہو؟"

مادھو ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ رندھیر اور موہنی کی ہنسی سے اس کا خوف

بھی آہستہ آہستہ جاتا رہا اور وہ مورتی جس نے تمام دنیا کی چیزوں کے علاوہ کنول کے پھول اور موہنی جیسی دلفریب صورتیں بنائی تھیں اسے پیاری نظر آنے لگی۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا اور چند بار کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مورتی کو چھونے کے بعد بے تکلفی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا اس نے موہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہلتے اور بولتے کیوں نہیں۔ یہ بہت سخت ہیں۔ شاید یہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں!"

موہنی نے کہا "ایسا نہ کہو بھگوان جی خفا ہو جائیں گے۔ ان کے سامنے لوگ بھجن گایا کرتے ہیں آؤ ہم بھی گائیں۔"

"بھجن کیا ہوتا ہے؟"

"تمہیں بھجن بھی نہیں آتا۔ اچھا ہم گاتے ہیں تم سنو!"

موہنی اور رندھیر کی شیریں آواز مندر میں گونجنے لگی۔ مادھو چند بار ان کے الفاظ منہ میں دہرانے کے بعد ان کے ساتھ گانے میں شریک ہو گیا۔

بھجن کے اختتام پر مادھو نے پوچھا "میں بھگوان کے سامنے بنسری بجاؤں؟"

رندھیر نے جواب دیا "بجاؤ۔"

مادھو نے ایک دل کش ترانہ شروع کیا۔ مندر سے باہر بنسری کے اونچے سروں سے شنکر اور گوپال چونک اٹھے۔

گوپال نے کہا "ارے شنکر! کتنی میٹھی آواز ہے؟"

شنکر نے ڈنڈا سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا: "ارے مارے گئے۔ ارے یہ وہی اچھوت لونڈا ہے جو جھیل کے کنارے بنسری بجایا کرتا ہے۔"

شنکر مندر کی طرف بھاگا اور گوپال اس کے پیچھے ہو لیا۔ انہیں بے تحاشا مندر میں داخل ہوتے دیکھ کر مادھو کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بنسری گر پڑی

اور وہ رندھیر کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

مادھو کو دیکھتے ہی شنکر نے غضب ناک ہو کر ڈنڈا اٹھایا اور پیشتر اس کے کہ رندھیر اور موہنی اس کے بچاؤ کی کوشش کر سکتے اس کا ڈنڈا مادھو کے سر پر پڑا مادھو تیورا کر زمین پر گرا اور اس کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ شنکر نے دوسری بار ڈنڈا اٹھایا لیکن گوپال نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا "شنکر! یہ بھگوان کا مندر ہے۔ کالی دیوی کا مندر نہیں۔"

رندھیر اگرچہ کم سن تھا لیکن اس کی رگوں میں ایک بہادر کشتری کا خون تھا اور پھر شہر کے سب سے بڑے سردار کے بیٹے کے سامنے ایک معمولی پجاری کی یہ حرکت ایک نئی بات تھی۔

اس نے گرج کر کہا: "تم نے اسے کیوں مارا، اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

پجاری کو غصے کی حالت میں سردار کے بیٹے کو پہچاننے میں ذرا دیر لگی۔

اس نے کہا "تم اسے لائے تھے یہاں؟"

"ہاں! ہم لائے تھے۔ مجھے گھر پہنچ لینے دو۔ دیکھنا پتا جی تمہارے ساتھ کیا کرتے ہیں۔"

"بے وقوف! تمہارے پتا کو بھی دیکھ لوں گا۔ تم نہیں جانتے۔ یہ ایک اچھوت ہے اور اسے مندر میں لانا مہا پاپ ہے۔" یہ کہہ کر شنکر نے مادھو کو پاؤں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا مندر سے باہر لے گیا۔ خون کی لکیر بھگوان کی مورتی سے شروع ہوئی سیاہ پتھر کے فرش پر گہرا نشان چھوڑتی ہوئی مندر سے باہر گھاس اور مٹی میں روپوش ہوتی چلی گئی۔

رندھیر غصے سے کانپتا اور موہنی روتی ہوئی اس کے پیچھے جا رہے تھے۔

گوپال رندھیر کو پہچان چکا تھا اور وہ سب سے پیچھے تھا۔ شنکر مادھو کو مندر کے

احاطے سے باہر چھوڑ کر گالیاں دیتا ہوا واپس مڑا۔ اس نے رندھیر کی طرف دیکھا اور دھمکانے کے لیے ڈنڈا دکھاتے ہوئے چلایا "اور تم اسے ساتھ لائے تھے؟"

اس عرصہ میں گوپال رندھیر کے پاس پہنچ چکا تھا اس نے رندھیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اب تم بھاگ جاؤ۔"

گوپال کے ان الفاظ سے رندھیر کی غیرت نے جوش مارا اس نے جلدی سے نیچے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور شنکر کی طرف دے مارا۔ پتھر نشانے پر لگا اور شنکر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔

ایسے معاملات میں گوپال شنکر کی نسبت زیادہ آزاد خیال نہ تھا لیکن شنکر سے کسی پرانی رنجش نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ شنکر انتہائی غصے کی حالت میں رندھیر کو پہچان نہ سکا۔ اگر وہ گوپال کی طرح ٹھنڈے دماغ سے کام لیتا تو شاید پتھر کھا کر بھی واہی تباہی بکنے کی بجائے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتا کہ یہ پتھر پھینکنے والے ہاتھ کسی معمولی بچے کے ہاتھ نہیں۔ شنکر اپنی پیشانی سے خون پونچھتا ہوا اٹھا اور ڈنڈا اٹھا کر زخم خوردہ چیتے کی طرح رندھیر کی طرف بڑھا لیکن گوپال نے اس کا راستہ روک لیا "پاگل ہو گئے ہو شنکر! جانتے ہو یہ کون ہے؟ ارے یہ سردار رام داس کا بیٹا ہے۔"

گوپال کے ان الفاظ نے شنکر کے دماغ میں جلتے ہوئے انگاروں پر برف کی ڈلی رکھ دی اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ڈنڈے کا وہ سرا جو آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ زمین کی طرف جھک گیا۔ اس نے خفیف ہو کر کہا "اچھا میں پروہت کے پاس جاتا ہوں۔ یہ خواہ سردار کا لڑکا ہو یا راجہ کا، اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ شودروں کو ساتھ ملا کر ہمارے مندر بھرشٹ کرے۔"

گوپال نے کہا "تمہاری بھاگ دوڑ کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ ہوگا کہ ہمیں دریا

سے پانی لاکر سارا مندر دھونا پڑے گا۔ شنکر یاد رکھو! پروہت کو پرسوں ہی اس کے باپ نے تین گائیں اور ایک گھوڑا دیا تھا۔ وہ تمام ذمہ داری ہم پر ڈال لے گا اور رام داس سے بگاڑنے کی بجائے اس کے بیٹے مندر میں ہماری جگہ دو نئے پجاری رکھ لینا زیادہ آسان ہوگا۔"

شنکر کچھ جواب دیئے بغیر رندھیر اور موہنی کو گھورتا ہُوا ایک طرف چل دیا۔

گوپال نے پیچھے سے آواز دے کر پُوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

دریا میں اشنان کے لیے۔ تم مندر سے خون صاف کرو۔"

گوپال نے جواب دیا "اپنی بلا میرے سر نہ ڈالو۔ تم مندر صاف کرو! میں تمہاری جگہ اشنان کر آتا ہوں۔"

گوپال کی طنز نے شنکر کی رفتار ذرا تیز کر دی۔

موہنی بھاگ کر مادھو کے پاس پہنچ چکی تھی۔ گوپال نے رندھیر سے کہا "جاؤ بیٹا! تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کتنا بڑا پاپ ہے۔ موہنی کو گھر لے جاؤ۔ وہ نحس شودر کے پاس کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔ جاؤ! پروہت آنے والا ہے اور مجھے مندر صاف کرنا ہے ورنہ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا۔ کل میرے لیے کھیر لاؤ گے نا؟"

رندھیر کچھ جواب دیے بغیر موہنی کی طرف چل پڑا اور گوپال مندر کی طرف لوٹ آیا۔

مادھو نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رندھیر نے کہا "موہنی! اس کا خون ابھی بند نہیں ہُوا۔ لاؤ کپڑا اس کا زخم نہ باندھ دوں۔"

موہنی نے جلدی سے اپنی اوڑھنی اتار کر رندھیر کو دی۔ رندھیر نے اس کا زخم باندھا۔ موہنی سِسکیاں لیتی اور آنسو پونچھتی ہوئی مادھو کے سامنے بیٹھ گئی۔

"تمہیں بہت درد ہوتا ہوگا؟" اس نے کہا۔

"نہیں!" مادھو نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

رندھیر نے پوچھا "تمہارا گھر کس طرف ہے؟ چلو تمہیں چھوڑ آئیں۔"

موہنی نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم فکر نہ کرو! رندھیر نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے اتنا بڑا پتھر مارا تھا اس کے سر پہ۔"

مادھو نے خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا "چلو! یہاں سے بھاگ چلیں"

رندھیر نے جواب دیا "بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہیں اب کچھ نہیں کہے گا۔"

تینوں بچّے وہاں سے چل دیے مادھو نے پہلے ان کے ساتھ پاؤں اٹھانے کی کوشش کی لیکن چند قدم چل کر اس کی رفتار سُست ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"میرا سر دُکھ رہا ہے۔ ذرا آہستہ چلو۔"

رندھیر اور موہنی نے اپنی رفتار کم کر دی۔

---

(۳)

جھیل کے کنارے پہنچ کر مادھو کو شانتا اور اپنی ماں دکھائی دی ــ کنول وحشت بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مادھو کو دیکھتے ہی وہ باغ باغ ہو گئی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"مادھو! مادھو! میرے لال تم کہاں تھے؟" اس نے مسرت کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ کیا ..... تمہارے سر پہ ..... اُف! ..... تمہارے سر سے خُون نکل رہا ہے ..... تمہیں کس نے مارا ..... انھوں نے ..... ؟" اس نے رندھیر اور موہنی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں ماتا! انھوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔"

"تو کس نے مارا تمہیں؟"

مادھو کی خاموشی پر موہنی نے جواب دیا "اسے شنکر نے مارا ہے۔"

کنول نے مادھو کے سر سے پٹی کھولتے ہوئے پوچھا "شنکر کون ہے اس نے میرے لال کو کیوں مارا؟"

رندھیر نے جواب دیا "میں نے بھی اس سے بدلہ لے لیا ہے۔"

کنول نے پوچھا "تم کون ہو بیٹا؟"

"میں رندھیر ہوں ہم اسے بھگوان دکھانے کے لیے مندر لے گئے تھے وہاں شنکر نے اسے مارا۔ میں بھی اس کا سر پھوڑ آیا ہوں۔"

کنول نے بدحواس سی ہو کر کہا "مندر میں۔۔۔۔ بھگوان دکھانے کیلئے؟"

"ہاں یہ کہتا تھا میں نے بھگوان نہیں دیکھا۔"

عہدِ ماضی کی کئی تصویریں کنول کی آنکھوں میں پھر گئیں اور وہ ایک گھڑی سوچ میں پڑ گئی۔

موہنی نے پوچھا "تم اس کی ماں ہو؟"

"ہاں بیٹی! یہ اوڑھنی تمہاری ہے؟"

"ہاں۔"

"تمہارا گھر شہر میں ہے؟"

"ہاں۔"

"یہ خون سے بھر گئی ہے۔ میں ابھی اسے دھو دیتی ہوں۔"

"نہیں اسے اس کے سر پر رہنے دیجئے۔"

"نہیں بیٹی! تمہاری ماں پوچھے گی تو کیا جواب دو گی؟"

"میں نے کئی دوپٹے گنوائے ہیں وہ مجھ سے نہیں پوچھے گی۔ آپ ا[illegible] زخم اچھی طرح باندھ دیں۔"

"تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟"

"موہنی۔"

"جیتی رہو بیٹی! چلو مادھو!"

رندھیر نے کہا "چلو ہم بھی چلیں موہنی!"

موہنی نے چلتے چلتے رک کر پوچھا "شنکر کہتا تھا یہ اچھوت ہے تم بھی اچھوت ہو؟"

کنول نے درد بھری آواز میں جواب دیا "میں۔۔۔ میں اچھوت ہوں لیکن میرا بیٹا۔۔۔۔!"

موہنی، کنول کا مطلب نہ سمجھ سکی لیکن کم سن ہونے کے باوجود وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اس نے یہ سوال پوچھ کر اچھا نہیں کیا۔ اس نے گھبرا کر دوسرا سوال کیا:

"اچھوت کیا ہوتے ہیں؟"

"تمہیں معلوم نہیں؟"

"نہیں تو!"

کنول نے جواب دیا "اچھوت انسان ہوتے ہیں، محبت کرنے والے انسان لیکن اس دنیا میں انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا۔ چلو مادھو! جاؤ بیٹا تم بھی ۔۔۔!"

موہنی اور رندھیر شہر کی طرف چل دیے۔ مادھو، کنول اور شانتا کچھ دیر وہیں کھڑے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ موہنی نے چند بار مڑ مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں

مادھو کو ایک نہ سمجھ لینے والا پیغام دے گئیں۔ کنول کو مادھو کا موہنی کی طرف اس طرح دیکھنا پسند نہ تھا لیکن شہر کے خوش وضع اور خوش پوش بچے کچھ اس قدر جاذب توجہ تھے کہ اس کی اپنی نگاہیں بھی دیر تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ بالآخر اس نے مادھو کی طرف دیکھا اور اپنے دل میں کہا "میرے لال! تم ان سے کسی بات میں کم نہیں تمہارا رنگ ان سے زیادہ سفید اور تمہاری آنکھیں ان سے زیادہ خوبصورت ہیں لیکن تم اپنی ماں کے پیٹ سے ایک اچھوت کی قسمت لے کر پیدا ہوئے ہو۔" اس نے مادھو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا: "چلو بیٹا! کیا دیکھتے ہو، تمہاری دنیا ان کی دنیا سے علیحدہ ہے۔"

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر کنول کچھ سوچ کر رک گئی اور مادھو کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولی: "بدھو کو کچھ نہ بتانا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ تمہیں کسی نے مارا ہے تو وہ بدلہ لیے بغیر نہ رہے گا اور ہم سب مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

مادھو نے تسلی دیتے ہوئے کہا "نہیں ماتا! میں اسے نہیں بتاؤں گا۔ میں کہوں گا کہ میں درخت پر سے گر پڑا تھا۔"

"اور مجھ سے یہ بھی وعدہ کرو کہ تم پھر اس طرف نہیں جاؤ گے اور ان بچوں سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"کیوں ماتا! انہوں نے تو مجھے نہیں مارا۔"

"بیٹا! اگر ان کے ماں باپ کو علم ہو گیا کہ ان کے بچے ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں تو وہ ہمیں اس جگہ سے نکال دیں گے تم جھیل کی دوسری طرف نہ جایا کرو۔"

"بہت اچھا ماتا! میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔"

---

(۴)

ارجن، موہنی کا باپ اپنے مکان کے صحن میں آم کے درخت کے سائے تلے چارپائی پہ بیٹھا ہوا تھا۔ ساوتری گھبرائی ہوئی باہر سے آئی۔

ارجن نے پوچھا "نہیں آئی موہنی؟"

ساوتری نے جواب دیا۔ بھگوان جانے کہاں چلی گئی۔ میں رندھیر کے گھر سے بھی پوچھ آئی ہوں۔ وہ بھی ابھی تک نہیں آیا۔"

"تو پھر اس کے ساتھ کہیں کھیل رہی ہو گی۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو جب بھوک لگے گی آ جائے گی۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو جاؤ نا اس کو تلاش کرو وہ جھیل پر گئے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔۔۔۔!"

ارجن نے ساوتری کو چھیڑنے کی نیت سے کہا "موہنی تمہاری طرح بیوقوف نہیں وہ مندر میں گئی ہو گی۔"

"اچھا آ لینے دو اسے! آج میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گی۔"

"اسے کچھ نہ کہنا اس عمر میں ہم بھی سارا دن باہر گزارا کرتے تھے۔"

"تمہارے پیار ہی نے تو اسے بگاڑا ہے۔"

"اچھا سر نہ کھاؤ! میں جاتا ہوں۔" ارجن اٹھ کر جوتا پہن رہا تھا کہ باہر کا دروازہ کھلا اور موہنی اور رندھیر داخل ہوئے۔

ارجن نے پھر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "لو وہ آ گئی۔ تم نے مفت میں شور مچا رکھا تھا کیوں بیٹی؟" اس نے موہنی سے مخاطب ہو کر پوچھا "تم نے اتنی دیر کہاں لگائی؟"

"پتاجی ہم جھیل پر گئے تھے اور وہاں پر . . . . . موہنی آگے کچھ نہ کہہ سکی اس کا گلا بیٹھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔"

"وہاں پر کیا ہُوا؟ ہائیں تم رو رہی ہو بتاؤ تو سہی کیا ہُوا؟"

ساوتری نے کہا "بیٹی! بتاتی کیوں نہیں۔ کیا ہُوا جھیل پہ۔ وہاں کسی نے مارا تو نہیں؟"

موہنی نے دل کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جھیل پر ایک لڑکا نہا رہا تھا اس نے مجھے یہ پھول دیے۔ ہمیں بگلے کے بچّے دکھائے ہم اسے بھگوان جی کے درشن کرانے کے لیے مندر لے گئے۔ شنکر نے ڈنڈا مار کر اس کا سر پھوڑ دیا۔" موہنی یہ کہہ کر سسکیاں لینے لگی۔

ارجن نے پوچھا "شنکر نے اسے کیوں مارا؟"

موہنی کی خاموشی پر رندھیر نے جواب دیا "وہ کہتا تھا یہ اچھوت ہے۔"

"اچھوت؟" ارجن نے بدحواس ہو کر کہا "ہرے ہرے! تم اچھوت کو مندر میں لے گئے تھے۔ اور موہنی! یہ پھول تم نے ایک اچھوت کے ہاتھ سے لیے ہیں؟"

"ہاں، اور یہ سیپ بھی!"

"انہیں دُور پھینک دو موہنی۔ یہ اپوتّر ہیں اور ساوتری! تم موہنی کو نہلا کر اس کے کپڑے بدل دو۔"

موہنی ان پھولوں کے اپوتّر ہونے کا راز نہ سمجھ سکی وہ بولی "پتاجی! یہ تو اس نے جھیل کے صاف پانی سے توڑے تھے۔"

"پانی صاف ہو یا گدلا۔ اچھوت کے ہاتھ کے توڑے ہوئے پھول پوتّر نہیں ہو سکتے۔"

"پتاجی! اس کے ہاتھ بھی صاف تھے۔ ہم گئے تھے تو وہ نہا رہا تھا۔"

ارجن نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا "اچھوت نہا کر چھوت نہیں بن سکتے مٹی ڈھل کر ہیرا نہیں بن سکتی۔ پھینک دو ان پھولوں کو۔"

موہنی نے ارجن کی منطق سے زیادہ اس کی گرجتی ہُوئی آواز سے مرعوب ہو کر پھول پھینک دیے۔ صحن میں کھڑی ہوئی بچھیا اٹھ کر پھولوں کی طرف بڑھی اور چند بار سونگھنے کے بعد منہ کھولے بغیر پیچھے ہٹ گئی۔

ارجن نے کہا "دیکھا ہماری گائیں بھی شودروں کے ہاتھ کی شے نہیں کھاتیں!"

رندھیر جو اس وقت تک خاموش کھڑا تھا، بول اٹھا "کنول کے پھول تو گائے کھایا ہی نہیں کرتی اگر آپ اپنے ہاتھوں سے بھی توڑ کر لائیں تو بھی یہ مُنہ نہ لگائے گی۔ بہت بھوکی ہو تو شاید کھا لے۔"

"تم خاموش رہو۔" ارجن نے اپنا کھسیانہ پن چھپاتے ہوئے کہا۔

رندھیر خاموش ہو گیا۔ موہنی نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس بحث کو طول دینا ضروری خیال کیا۔ وہ بولی "پتاجی! اس کے ہاتھ بالکل ہماری طرح تھے اگر یہ پھول ہمارے ہاتھوں سے اپوتّر نہیں ہوتے تو اس کے ہاتھ لگنے سے کیسے اپوتّر ہو گئے؟"

"بیٹی! وہ سر سے لے کر پاؤں تک اپوتّر ہیں اور ان کی چھوت سے ہر پوتّر شے اپوتّر ہو جاتی ہے۔"

"پتاجی! انہیں مندر میں لے جانا بھی پاپ ہے؟"

"مہا پاپ"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ بھگوان انہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ وہ بھگوان کے مندر کو بھرشٹ کر دیتے ہیں۔"

"بھگوان ان سے نفرت کیوں کرتا ہے کیا وہ اس کے بنائے ہوئے نہیں؟"

"تم بہت بے وقوف ہو موہنی۔ بھگوان نے انہیں بنایا ہے۔ لیکن وہ نیچ ذات ہیں۔"

"وہ نیچ ذات کیوں ہیں؟"

"کیونکہ بھگوان نے انہیں اپوتر مٹی سے بنایا ہے۔"

"بھگوان نے انہیں اپوتر مٹی سے کیوں بنایا؟"

"موہنی اب زیادہ بکواس کی تو زبان کھینچ ڈالوں گا۔ بھگوان کی مرضی میں ہم دخل نہیں دے سکتے وہ جسے چاہتا ہے اونچی ذات اور جسے چاہتا ہے نیچی ذات میں پیدا کرتا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں ایک جیسی نہیں ہوتیں چاند سورج سے چھوٹا اور ستارے اس سے چھوٹے ہیں۔ باغ میں کوئی درخت بڑا اور کوئی چھوٹا ہوتا ہے۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور پھل دار درخت ایک ہی باغ میں اُگتے ہیں۔ لیکن ایک کو کاٹ کر جلایا جاتا ہے اور دوسرے کو سلامت رکھنے کے لیے پانی دیا جاتا ہے۔"

موہنی بظاہر مطمئن ہو کر خاموش ہو گئی لیکن وہ دل ہی دل میں ایسے بے انصاف بھگوان کو کوس رہی تھی جس نے شنکر جیسے بدوضع آدمی کو پوتر اور مادھو جیسے خوب صورت لڑکے کو اپوتر مٹی سے پیدا کیا تھا۔ اس بحث کے اختتام پر اس کے دماغ میں بھگوان کا تصوّر ایک زبردست مگر نا انصاف۔ ایک عظیم لیکن ہیبت ناک طاقت کا تھا اور اپنے انصاف پسند اور رحم دل بھگوان کا یہ نیا تصوّر اس کے معصوم دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تھا۔ عام حالات میں موہنی کی عمر کی کوئی اور

لڑکی شاید اس مسئلہ پر زیادہ غور نہ کرتی لیکن وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھی اور کسی واقعہ کو سطحی نظر سے دیکھنے کی عادی نہ تھی اس کے دماغ پر جو بھگوان کے بہترین تصورات سے روشن تھا نادانستہ طور پر اضطراب کی سیاہی آہستہ آہستہ قبضہ جمانے لگی۔

بھگوان کا اوتار

چار سال کی جسمانی اور ذہنی ترقی نے ان بچّوں کو چھوت اور اچھوت کے درمیان پیدائشی فرق کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ رندھیر اور موہنی کے ماحول نے انہیں یہ سکھا دیا تھا کہ وہ پچھلے جنم کی کسی نیکی کی بدولت اونچی ذات والوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ مادھو کو بھی اپنے متعلق یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ ایک بدقسمت اچھوت ہے لیکن اسے اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کہ وہ اچھوت کیوں ہے؟

اپنے جھونپڑے کے باہر اس کی پرواز صرف ان لوگوں کے گھروں تک محدود تھی جو اس کی طرح ہندو سماج کے خوب صورت اور مقدس شہر کی چار دیواری سے باہر اپنے بوسیدہ جھونپڑوں میں زندگی کے بُرے بھلے دن گزار رہے تھے اور یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے کہ وہ اچھوت کیوں ہیں۔ انہیں اونچی ذات والوں کے اس عقیدہ کا بھی علم نہ تھا کہ وہ پچھلے جنم کے کسی ناقابلِ تلافی گناہ کی سزا بھگتنے کے لیے اچھوت بنا دیے گئے ہیں۔

معمولی حالات میں مادھو کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان مسائل پر زیادہ توجہ دیتا۔ لیکن موہنی اور رندھیر کی ملاقات پر یہ نیا انکشاف کہ تمام چیزیں بھگوان کی بنائی ہوئی ہیں اس کی سادہ اور مختصر سی کتابِ زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر چکا تھا۔ وہ صبح و شام ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر کبھی شہر اور کبھی اچھوتوں کی بستی کی

طرف دیکھتا اسے ایک طرف مسرت رقص کرتی اور دوسری طرف بے کسی کے آنسو بہاتی نظر آتی۔ وہ جھونپڑوں کی غربت اور افلاس کے دل شکن مناظر سے آنکھیں پھیر لیتا اور شہر کے اونچے ایوانوں کی شان و شوکت اور ان میں بسنے والوں کی عظمت سے مرعوب ہو کر رہ جاتا۔ جب سورج غروب ہو جانے پر شہر کے قریب مندر کی گھنٹی بجتی اور فضا میں ناقوس کی آواز گونجتی تو اس کے خیالات اس عظیم الشان عمارت کے اردگرد چکر لگاتے جس میں دنیا کی ہر ادنیٰ اور اعلیٰ شئے کا پیدا کرنے والا موجود تھا۔

مندر کے بھگوان کی خیالی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی اور وہ اپنی بدحالی اور بے کسی بھول کر کائنات کی اس زبردست قوت کی تعظیم کے لیے سر جھکا دیتا۔ جس کے دم سے دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی رنگینی اور پھولوں کی تازگی قائم تھی جس کے اشاروں پر ہوائیں چلتی۔ بادل دوڑتے اور بجلیاں کوندتی تھیں۔ جس نے سورج کو جاہ و جلال، چاند کو دل فریبی۔ ستاروں کو دل کشی اور پھولوں کو رعنائی عطا کی تھی۔ مادھو کو بھگوان کے روشن تصورات کے سامنے اپنے ماحول کی تاریکیاں سمٹتی نظر آتیں۔ زمین و آسمان پر بھگوان کی عظمت کا اعتراف کروانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اور اگر یہ دل کش مناظر نہ بھی ہوتے تو بھی مادھو اس بھگوان کو کیوں کر بُرا کہہ سکتا تھا جس نے رندھیر اور موہنی جیسی تصویریں بنائی تھیں۔

اگر مادھو اور ان بچّوں کے درمیان سماج کی ناقابلِ عبور دیوار حائل نہ ہوتی اور اگر ان سے ملنے کی تمام راہیں مسدود نہ ہوتیں تو یہ دنیا اس کے لیے کس قدر رنگین ہوتی؟ قدرت کے یہ مناظر اسے کس قدر حسین نظر آتے؟ رندھیر اسے یاد آتا تھا لیکن اس کی یاد میں وہ بے قراری نہ تھی جو موہنی کی یاد میں تھی۔ موہنی کے بغیر اسے بھگوان کی یہ دنیا ان تمام حسین مناظر کے باوجود غیر مکمل نظر آتی تھی۔

جب رات کی تاریکی اچھوتوں کے جھونپڑوں کو اور زیادہ بے رونق بنا دیتی

اور شہر کا ہر کُوچہ چراغوں سے جگمگا اٹھتا تو مادھو کے معصوم دل میں اضطراب کی ایک لہر اٹھتی وہ اپنے دل میں کہتا رندھیر اور موہنی اونچی ذات کے بچوّں کے ساتھ ان چراغوں کی روشنی میں کھیلتے ہوں گے۔ کاش! میں بھی ان میں سے ایک ہوتا۔ ان کے ساتھ کھیلتا۔ انہیں بنسری سناتا۔ ان کے ساتھ بھگوان کے خوبصورت مندروں کی سیر کرتا۔ وہ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ نہیں! نہیں!! وہ مجھے نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ کسی دن میری تلاش میں ضرور آئیں گے۔ میں رندھیر کو جھیل عبور کرکے دکھاؤں گا۔ موہنی کو گہرے پانی سے پھُول لا کر دوں گا۔ وہ بہت خوش ہو گی لیکن نہیں ___ میں ایک اچھوت ہوں وہ میرے توڑے ہوئے پھولوں کو ہاتھ نہیں لگائے گی ___ وہ میری طرف دیکھ کر آنکھیں بند کر لے گی۔ میری آواز سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے گی . . . لیکن کیوں؟"

مادھو رات کے وقت سونے سے پہلے اکثر یہ ارادہ کرتا کہ صبح وہ جھیل کے دوسرے کنارے جا کر موہنی اور رندھیر کی راہ دیکھے گا لیکن رات کی تاریکی کے سُہانے سپنوں کی دنیا صبح کی روشنی میں درہم برہم ہو جاتی وہ کبھی تو جھیل کے دوسرے کنارے جانے کا ارادہ بدل دیتا اور کبھی امید و بیم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بدھوا اور کنول سے آنکھ بچا کر اپنی منزلِ مقصود کا رُخ کرتا لیکن مندر تک پہنچتے پہنچتے مصلحتیں اس کی اٹھتی ہوئی اُمنگوں کو دبا لیتیں۔

اسے بار بار یہ خیالات پریشان کرتے۔ شہر والوں نے انہیں چھوت اور اچھوت کا فرق سمجھا دیا ہو گا۔ ممکن ہے کہ وہ میری طرف دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیں لیکن اگر وہ بدل نہ بھی گئے ہوں تو بھی میرا ان سے ملنا ٹھیک نہیں ہے اگر شہر والوں کو اس بات کا علم ہو گیا تو ہمیں مار کر نکال دیں گے اور پھر ان سے ملنے کی اُمید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔" یہ سوچ کر مادھو واپس لَوٹ آتا۔

لیکن عقل ہر وقت دل کا ساتھ نہ دیتی۔ بعض اوقات ارادے کا سیلاب مصلحتوں کے بند کو بہا لے جاتا۔ اور مادھو مندر کے راستے کے قریب کسی جھاڑی کے نیچے چھپ کر یا کسی درخت کے اوپر چڑھ کر موہنی کی راہ دیکھتا۔ چند مرتبہ اسے رندھیر اور موہنی کو مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے میں کامیابی بھی ہوئی لیکن وہ اکیلے نہ تھے۔ شہر کی چند لڑکیاں اور لڑکے ان کے ساتھ ہوتے اور مادھو کو ان کے سامنے جانے کی جرأت نہ ہوتی۔

---

(۲)

ایک دن وہ درخت پر چڑھ کر ان کا انتظار کر رہا تھا کہ رندھیر، موہنی اور گاؤں کے اور آٹھ دس بچے آئے اور جھیل کے کنارے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔ رندھیر کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ تیرتا دیکھ کر مادھو کے دل میں کئی بار درخت سے اتر کر جھیل میں کُودنے کا خیال آیا لیکن ایک شودر کا احساسِ کمتری اس کی راہ میں حائل رہا۔ موہنی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس درخت سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر جھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ مادھو کے نزدیک دوسرے درخت پر ایک کوئل نے کُوہُو، کُوہُو کا ترانہ چھیڑا اور موہنی درخت کی طرف منہ پھیر کر کوئل سے کہیں زیادہ میٹھی آواز میں اس کے نغموں کا جواب دینے لگی۔ مادھو کو اس کا چہرہ اب اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ شہر کے دوسرے بچوّں کے ساتھ وہ تاروں میں چاند معلوم ہوتی تھی۔

موہنی کُوہُو، کُوہُو کرتی ہوئی کوئل کو دیکھنے کے لیے درخت کی طرف بڑھی۔ مادھو کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ موہنی کی نگاہوں سے بچتا درخت کی ٹہنیوں سے

لٹکتا ہوا ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے درخت پر جا پہنچا اب وہ جھیل کے کنارے کھیلنے والے بچّوں کی نگاہوں کی رسائی سے باہر تھا۔ اسے صرف موہنی نظر آ رہی تھی۔ کوئل خاموش ہو چکی تھی اور موہنی درختوں کے درمیان کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مادھو درخت سے نیچے اُترا اور موہنی کی طرف دیکھنے لگا اس کا دل مسرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ موہنی کوئل کو دیکھنے سے مایوس ہو کر واپس لوٹنے لگی۔

مادھو نے محسوس کیا کہ قدرت کا ہاتھ اسے مسرت کے آسمان سے کھینچ کر زمین کی بھیانک گہرائیوں کی طرف لا رہا ہے۔ اتنی خواہشوں، التجاؤں اور دعاؤں کے بعد موہنی آئی اور اب جا رہی ہے۔ مادھو اسے برداشت نہ کر سکا۔ شودر کا احساس کمتری فنا ہو گیا۔ انسانیت کا دبا ہوا شعور جاگ اٹھا اور اس شعور کے بے پناہ سیلاب کے ایک ہی ریلے نے تمام وہ دیواریں جو چھوت اور اچھوت کے درمیان صدیوں میں تعمیر ہوئی تھیں توڑ ڈالیں۔ مادھو نے جلدی سے اپنی جیب سے بنسری نکالی اور موہنی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دھیمے سُروں میں ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ یہ دھیمے سُر شودر کی دبی ہوئی آواز کے ترجمان تھے۔ موہنی بنسری کی آواز سن کر رُکی کچھ سوچ کر واپس مُڑی اور اضطراب، مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی مادھو کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ مادھو کے دل میں ایک طوفان سا اٹھا اور بنسری اس کے ہونٹوں سے جُدا ہو گئی۔

موہنی نے کہا: "کون؟ مادھو — مادھو...!

موہنی کی آواز میں نفرت یا حقارت کی بجائے شفقت، انس اور مروّت پا کر مادھو نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے ساتھ احسانمندی کے آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگے۔

"موہنی! تم آ گئیں! تم نے مجھے پہچان لیا؟" مادھو نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں جھپکیں اور چمکتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک کر گالوں پر سے ہوتے ہوئے زمین پہ آ گرے۔

موہنی نے کہا: "میں اور رندھیر کئی بار جھیل پہ آئے لیکن تم کہیں نظر نہ آئے اتنی مدت کہاں رہے؟"

مادھو نے جواب دیا "تو تم مجھے بھولے نہیں — میں یہیں رہتا تھا۔ ماتا نے جھیل پر آنے سے منع کر دیا تھا لیکن میں چھپ چھپ کر کئی بار یہاں آیا ہوں تمہیں بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں لیکن تمہارے ساتھ دوسروں کو دیکھ کر میں تمہارے سامنے نہ آ سکا۔"

موہنی ایک گہری سوچ میں کچھ دیر مادھو کی طرف دیکھتی رہی وہ شہر کے تمام لڑکوں سے خوبصورت تھا اس کا جسم مندر کی سب سے زیادہ حسین مورتی سے زیادہ سڈول اور متناسب تھا لیکن پھر بھی وہ ایک شودر تھا اور موہنی حیران تھی کہ اسے اس سے نفرت کیوں نہیں ہوتی وہ اس کو دیکھ رہی تھی اس کی آواز سُن رہی تھی اس کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکی۔ شودر کے آنسو کچھ دیر اس کے وہاں ٹھہرنے کی قیمت ادا کر چکے تھے۔

اچانک رندھیر کی آواز آئی "موہنا! موہنا! کہاں ہو؟ آؤ گھر چلیں۔"

موہنی نے خوف زدہ ہو کر کہا "میں جاتی ہوں۔"

مادھو نے سراپا التجا بن کر کہا "پھر آؤ گی؟"

"شاید... مجھے معلوم نہیں" موہنی نے جھیل کی طرف بھاگتے ہوئے جواب دیا۔

مادھو کی زندگی کی روشنی درختوں کی آڑ میں غائب ہو گئی لیکن اس کے دل

کی مغموم فضا میں امید کے ہزاروں چراغ جگمگا اٹھے۔ وہ اچھلتا، کودتا اور بنسری بجاتا ہوا گھر پہنچا۔ کنول نے کھانا لا کر سامنے رکھا اس نے چند لقمے کھائے اور کہا "ماتا! مجھے بھوک نہیں۔"

"آج بہت خوش ہو بیٹا! کہاں گئے تھے؟"

"یہیں تھا ماتا! تمہیں بنسری سناتا ہوں۔"

مادھو یہ کہہ کر بنسری بجانے لگا۔ آس پاس کے شودروں کے بچے اس کی بنسری کی آواز سن کر اس کے گھر جمع ہو گئے۔

شام کے وقت حسب معمول مادھو نے ایک پہاڑی کا رخ کیا۔ آج اسے اپنا جسم بہت ہلکا معلوم ہوتا تھا اور وہ چلنے کی بجائے بھاگ رہا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ آج بھگوان کی دنیا اسے مکمل نظر آتی تھی۔ آج اسے بھگوان کی زبردست قوت کا اعتراف ہوا تھا۔ موہنی اسی کے اشارے سے جھیل پر پہنچی تھی اسے درخت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئل کو بھی اسی نے بھیجا تھا۔ اس کی بنسری کے سروں کو بھگوان ہی نے یہ تاثیر عطا کی تھی کہ موہنی چلتے چلتے واپس لوٹ آتی اور یہ بھی اسی کی دیا تھی کہ ایک اونچی ذات کی لڑکی نے اتنے سالوں کے بعد اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اس کے ساتھ نفرت سے پیش نہ آئی۔

بھگوان کے اس خوش گوار تصور نے اس کی دبی ہوئی امنگوں کو اٹھتے ہوئے ولولوں میں تبدیل کر دیا وہ تصور میں اپنی بوسیدہ جھونپڑی سے نکل کر شہر کے خوبصورت مکانات کی سیر کر رہا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھ رہا تھا جس میں بسنے والے چھوت اور اچھوت کے الفاظ سے ناآشنا تھے۔

بھگوان کی زبردست طاقت پر اعتماد اور یقین کی بدولت زندگی کے ہر افق پر اسے

کی گھٹائیں اسے صبح کی آمد کا پیغام دینے لگیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"بھگوان! میں جانتا ہوں کہ میں ایک اچھوت ہوں۔ مجھے تیرے مندر میں پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں ان کے شہر میں بھی نہیں جا سکتا لیکن تو بھگوان ہے اور تیرے لیے یہ مشکل نہیں کہ دنیا سے چھوت اور اچھوت کا امتیاز مٹا دے" اس دعا کے بعد مادھو اونچی آواز میں وہ بھجن گانے لگا جو اس نے چار سال قبل رندھیر اور موہنی سے مندر میں سیکھا تھا۔

اگلے دن مادھو جھیل کے کنارے چکنی مٹی سے بھگوان کی عجیب و غریب مورتی بنا کر اسے خوش کرنے کے لیے بھجن گا رہا تھا۔

---

(۳)

دو سال اور گزر گئے۔ مادھو اس عرصہ میں مٹی کی مورتیاں بنانے میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ کئی مورتیاں بنا بنا کر توڑنے کے بعد اس نے ایک ایسی مورتی بنائی جو باقی تمام مورتیوں کے مقابلے میں خوب صورت تھی۔ مادھو نے اسے جھیل کے کنارے ایک جھاڑی میں چھپا کر رکھ دیا۔

وہ دن میں کم از کم ایک بار جھیل پر ضرور آتا اور بھگوان کی خود ساختہ مورتی کے سامنے موہنی اور رندھیر سے سیکھا ہوا بھجن گا کر واپس آ جاتا۔

ایک دن رندھیر اور موہنی مندر سے واپس آتے ہوئے جھیل کے قریب سے گزرے انہیں کچھ فاصلے پر بنسری کی دل کش آواز سنائی دی۔ موہنی نے چلتے چلتے رک کر کہا: "رندھیر! بھلا یہ بنسری بجانے والا کون ہو سکتا ہے؟"

رندھیر نے جواب دیا "میں نے پرسوں یہاں سے گزرتے ہوئے بھی یہ آواز سنی تھی۔ کوئی خوب بجاتا ہے!"

"تم نے اسے کبھی دیکھا نہیں؟"

"کبھی نہیں۔"

"تم نے دیکھا ہے لیکن تم بھول گئے ہو۔"

"میں نے دیکھا ہے! کب؟"

موہنی نے کہا "تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہمیں جھیل کے کنارے ایک لڑکا ملا تھا اور ہم اسے مندر میں لے گئے تھے۔"

"ہاں وہ......" رندھیر نے اپنے حافظہ پر زور دیتے ہوئے کہا "جسے شنکر نے مارا تھا۔ کیا نام تھا اس کا..... مادھو؟"

موہنی نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "چلو اسے دیکھیں۔"

"لیکن وہ تو شاید اچھوت تھا۔"

موہنی کا دل بیٹھ گیا اس نے کہا "لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ اچھوت ہے۔ شاید تم بھی اسے دیکھ کر اچھوت نہ کہہ سکو۔"

رندھیر نے جواب دیا "اچھوت شکل سے تو ظاہر نہیں ہوتے۔"

موہنی نے کہا "رندھیر! بھلا ہم اچھوتوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

رندھیر کو موہنی اور اس کے باپ کا مباحثہ یاد آ گیا۔ اس نے جواب دیا "میں نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔"

بنسری کا دل کش نغمہ ختم ہوا اور کسی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی بھجن تھا جسے مادھو بھیرویں کے دل کش سُروں میں گا رہا تھا۔

رندھیر نے چونک کر کہا "نہیں، یہ کوئی اچھوت نہیں ہو سکتا۔ یہ بھجن گا رہا

ہے اور اس کی آواز ہمارے شہر کے تمام بھجن گانے والوں سے میٹھی ہے۔ چلو موہنی اسے دیکھیں!"

موہنی رندھیر کو بتانا چاہتی تھی کہ یہ وہی بھجن ہے جو مادھو نے ان سے مندر میں سیکھا تھا۔ لیکن مادھو کو دیکھنے کی خواہش اس کی ہر خواہش پر غالب آ گئی اور وہ کچھ کہے بغیر رندھیر کے ساتھ چل دی۔

کچھ دُور چلنے کے بعد موہنی اور رندھیر ایک جھاڑی کے قریب کھڑے مادھو کو اپنے دل کش راگ کی گہرائیوں میں کھویا ہوا دیکھ رہے تھے۔ رندھیر اسے پہچان نہ سکا۔

مادھو نے راگ ختم کر کے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور رندھیر اور موہنی کو دیکھ کر مبہوت سا ہو کر رہ گیا اس نے تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر کہا "تم آ گئے! بھگوان نے تمہیں بھیج دیا۔"

اس سوال پر رندھیر نے موہنی اور موہنی نے رندھیر کی طرف دیکھا۔ بالآخر موہنی نے جواب دیا "ہم تمہاری آواز سن کر آئے ہیں۔ تم بہت اچھا گاتے ہو۔"

"تمہیں میرا گانا پسند ہے؟"

"کیوں نہیں۔ رندھیر ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے شہر میں تم سے اچھا گانے والا کوئی نہیں۔"

رندھیر نے پوچھا "تم مادھو ہو؟"

"ہاں تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"

"یہ بھجن تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"تمہیں یاد نہیں۔ تم ہی نے تو سکھایا تھا مجھے۔"

"کہاں! کب؟"

"اس دن! مندر میں؟"

رندھیر کو بہت سی باتیں یاد آگئیں اس نے پھر پوچھا "لیکن یہ تو بہت مدت کی بات ہے تمہیں اب تک یہ بھجن کیسے یاد رہا؟"

"میں اسے ہر روز بھگوان کے سامنے گایا کرتا ہوں۔"

تمہارا بھگوان؟ وہ کہاں ہے؟"

اس جھاڑی میں۔ ٹھہرو میں تمہیں ابھی دکھاتا ہوں۔ مادھو نے جھک کر جھاڑی کے نیچے سے مٹی کی مورتی نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔

رندھیر نے پوچھا "یہ تم کہاں سے لائے؟"

مادھو نے جواب دیا "میں نے خود بنایا ہے۔ یہ تمہارے بھگوان سے بہت چھوٹا ہے میں اب ایک بڑا بھگوان بناؤں گا۔ بالکل تمہارے بھگوان جیسا۔ تم اسے دیکھنے کے لیے آؤ گے؟"

اس کے جواب میں رندھیر اور موہنی خاموش رہے۔

مادھو نے سراپا التجا بن کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ضرور آنا میں ہر روز پہاڑی پر چڑھ کر تمہارے خوبصورت شہر کو دیکھا کرتا ہوں۔ سال میں ایک رات وہاں بہت روشنی ہوا کرتی ہے۔ ہر مکان پر چراغوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔"

موہنی نے کہا "ہاں وہ دیوالی کی رات ہوتی ہے۔"

"دیوالی کیا ہوتی ہے؟"

اس دن رام چندر جی لنکا کو فتح کر کے گھر واپس آئے تھے اور شہر والوں نے ان کے آنے کی خوشی میں دیے جلائے تھے۔"

"رام چندر جی کون تھے؟"

"وہ بھگوان کے اوتار تھے۔"

"بھگوان کا اوتار کیا ہوتا ہے؟"

"ایک ایسا انسان، جس میں بھگوان جیسی طاقت ہو۔"

"انسان میں بھگوان جیسی طاقت کیسے آسکتی ہے؟"

"اس کی پوجا کرنے سے۔"

"تو میں بھی بھگوان کی پوجا کیا کروں گا لیکن ماتا کہتی تھی کہ تم خواہ کچھ کرو، اونچی ذات والوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ کیا میں بھگوان کی پوجا سے بھی تمہارے جیسا نہیں بن سکتا؟"

موہنی خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں رندھیر سے اس سوال کا جواب پوچھ رہی تھیں۔

مادھو نے بیتاب ہو کر کہا "بتاؤ! بھگوان کے لیے بتاؤ۔ کیا میں تمام عمر شودر رہوں گا؟"

موہنی نے جواب دیا۔ نہیں! نہیں!! بھگوان تمہاری مدد کریں گے۔"

کسی نے جھیل کی طرف سے آواز دی۔ "بھیا! بھیا!!"

مادھو نے شانتا کی آواز پہچان کر جلدی سے مورتی کو اٹھا کر جھاڑی میں چھپا دیا اور کہا "شانتا میں یہاں ہوں۔"

رندھیر اور موہنی جانا چاہتے تھے لیکن شانتا کو دیکھ کر رک گئے۔ شانتا نے درختوں کی آڑ سے نمودار ہوتے ہوئے کہا "میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

مادھو نے جواب دیا "کچھ نہیں۔ شانتا آؤ۔"

مادھو کے پاس رندھیر اور موہنی کو دیکھ کر شانتا لجاتی ہوئی آگے بڑھی۔

"یہ تمہاری بہن ہے؟" رندھیر نے سوال کیا۔

"ہاں! تم نے نہیں پہچانا اسے؟"

رندھیر نے مادھو کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے شانتا کو کئی بار سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد اپنے دل میں کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں بہن بھائی شودر ہوں۔ ہمارے شہر میں اُن جیسا کوئی برہمن ہے نہ کشتری۔ کیا بھگوان ایسی صورتیں بنا کر ان سے نفرت کر سکتا ہے؟"

رندھیر نے کہا "اچھا مادھو! اب ہم جاتے ہیں لیکن میں تم سے ایک بات کہتا ہوں۔"

"کہو۔"

"وہ مورتی چھپا کر رکھنا اور آئندہ شہر کے کسی آدمی کے سامنے یہ بھجن نہ گانا"

"مورتی تو میں چچا کے ڈر سے چھپا کر رکھتا ہوں لیکن بھجن گانے میں کیا ہرج ہے؟"

"تم نہیں جانتے لیکن اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ چلو موہنی!"

رندھیر اور موہنی چل دیے اور مادھو اور شانتا دیر تک کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔

"یہ کون تھے؟" شانتا نے پوچھا۔

مادھو نے جواب دیا "بھگوان کے اوتار۔"

"وہ کیا ہوتے ہیں؟"

"تم نہ سمجھ سکو گی۔ چلو گھر چلیں۔"

شانتا نے منہ بناتے ہوئے کہا "واہ! تو میں تمہاری جیسی سمجھ بھی نہیں رکھتی تمہارا مطلب یہی تھا نا کہ یہ شہر والے ہیں؟"

مادھو ہنس پڑا۔

اب تک رندھیر کی زندگی کی تمام دلچسپیاں سیر و شکار، نیزہ بازی اور گھوڑے کی سواری تک محدود تھیں۔ اس کے لیے بھگوان، دیوتا، چھوت اور اچھوت کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس نے چلتے چلتے رک کر موہنی سے سوال کیا "موہنی کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بھگوان، شانتا اور مادھو جیسی صورتیں بنائے اور پھر ان سے نفرت کرے؟"

موہنی نے جواب دیا "رندھیر! میرا تو یہ خیال ہے کہ بھگوان کسی سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ جب ایک ماں اپنے خوبصورت اور بدصورت بچوں سے یکساں طور پر پیار کرتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بھگوان! جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے سب کو ایک جیسی آنکھیں اور ایک جیسے ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔ وہ ایک انسان کو پوتر اور دوسرے کو اپوتر سمجھتا ہو۔۔۔؟"

سنگ تراش

شام کے وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ کنول، بدھو، شانتا اور مادھو کھانا کھانے کے بعد جھونپڑی سے باہر چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ مغرب کی طرف بجلی چمکی اور بدھو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنول نے کہا: "کیوں بھیا! تم تو کہتے تھے مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔"

بدھو نے چارپائی اٹھاتے ہوئے جواب دیا "یہ بادل برسے گا ضرور، اور میری نیند خراب ہو گی۔ میں اندر جاتا ہوں۔ آج گرمی تو ہے نہیں۔"

شانتا نے کہا "میں بھی اندر سوؤں گی۔ چلو بھیا! تم بھی اندر چلو۔"

مادھو، شانتا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے کنول سے مخاطب ہو کر بولا "ماتا! اٹھو۔ تمہاری چارپائی اندر ڈال دوں۔ بارش آگئی تو رات کو تمہاری نیند خراب ہو گی۔"

کنول اٹھ کر جھونپڑی میں چلی گئی اور مادھو نے اس کی چارپائی اٹھا کر اندر پہنچا دی۔

کنول نے اپنی چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا "بیٹا! تم بھی اپنی چارپائی اندر لے آؤ۔"

مادھو نے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا "مجھے ابھی نیند نہیں آئی ماتا! اندر کچھ گرمی ہے۔ میں ابھی آجاتا ہوں۔"

بدھو نے کہا "بارش آگئی تو ہمیں نہ جگانا۔"

"نہیں چچا! میں دبے پاؤں اندر آجاؤں گا۔"

مادھو باہر آکر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دور سے مندر کی گھنٹی کی آواز آ رہی تھی اور مادھو کا دل دھڑک رہا تھا۔

شانتا نے اندر سے آواز دی "بھیا! مجھے کہانی سناؤ۔"

مادھو نے جواب دیا "اری چپ! چچا کی نیند خراب ہو گی۔"

"شور نہ کرو شانتا!" بدھو نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"تو میں باہر آجاتی ہوں۔"

شانتا دبے پاؤں باہر نکلی اور مادھو جلدی سے بستر پر لیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

"ہوں مکّار کہیں کا۔ ابھی باتیں کر رہا تھا اور اتنی جلدی سو بھی گیا ہے۔"

"دیکھو شانتا! مجھے تنگ نہ کرو ورنہ پیٹوں گا۔"

کنول نے اندر سے آواز دی "شانتا! کیوں تنگ کرتی ہو اسے۔ تمہیں رات کو بھی آرام نہیں آتا؟"

بدھو پھر ایک بار بڑبڑایا "شانتا! کیا شور مچا رکھا ہے تم نے؟"

شانتا مایوس ہو کر اندر چلی گئی۔

مادھو بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں جھونپڑی کے پیچھے سے ہوتا ہوا جھیل کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دور جا کر وہ راستے کے درختوں اور جھاڑیوں سے بچتا ہوا پوری رفتار کے ساتھ مندر کی طرف بھاگنے لگا۔ جھیل کے کنارے مینڈکوں اور جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لیکن مادھو کے کان صرف ایک آواز سن رہے تھے اور وہ مندر کی گھنٹی کی آواز تھی۔ گھنٹی پر ہر نئی ضرب اس کے دل کی دھڑکن اور قدموں کی رفتار میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے بار بار

یہ فقرہ دُہرا رہا تھا "میں بھگوان کا اوتار بنوں گا .... میں بھگوان کا اوتار بنوں گا"۔

---

(۱۴)

مندر سے کچھ فاصلے پر مادھو رُکا اور تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھتا ہُوا آہستہ آہستہ پاؤں اٹھانے لگا۔ مندر کے دروازوں سے چراغوں کی روشنی نظر آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ مندر کے نگہبانوں کی خوفناک آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ آسمان پر بادل کی سیاہ چادر کہیں کہیں پھٹ چکی تھی اور تارے نظر آ رہے تھے۔ مادھو کھُلی فضا سے ہٹ کر درختوں کے تاریک سائے میں کھڑا ہو گیا۔ مندر کی گھنٹی بند ہو چکی تھی اور اندر کوئی بھجن گا رہا تھا۔ مادھو بھجن کے الفاظ اچھی طرح نہ سُن سکا۔ وہ جھجکتا ہُوا آگے بڑھا اور سب سے آخری درخت کے نیچے پہنچ گیا جو مندر کے برآمدے سے کوئی بیس قدم دُور تھا۔ بھجن کے الفاظ اب اسے صاف طور پر سنائی دینے لگے۔ مندر کے دروازے سے اسے چند آدمیوں کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے جھک کر دیکھا چار آدمی پچھلی دیوار کی طرف منہ کیے ایک مورتی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بھجن گا رہا تھا، مادھو اس کے ساتھ ساتھ بھجن کے الفاظ دہراتا رہا۔ بھجن ختم ہُوا اور چاروں پُجاری باہر نکل آئے۔ مادھو چراغوں کی دھیمی روشنی میں کسی کو نہ پہچان سکا تاہم دو آدمیوں کے متعلق اسے شک ہُوا کہ یہ مندر کے پرانے نگہبان ہیں۔

ایک نے کہا "پروہت جی! اندھیرا ہے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟"

پروہت نے جواب دیا "اور پھر تمہیں یہاں چھوڑنے کے لیے کون آئیگا؟"

دوسرا بولا "ٹھیک ہے پروہت جی! شنکر بھوتوں سے بہت ڈرتا ہے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

پروہت نے پھر جواب دیا "شنکر ڈرتا ہے لیکن میں نہیں ڈرتا۔ میں اکیلا جاؤں گا۔ تم دونوں جسونت جی کی سیوا میں رہو۔" پروہت یہ کہہ کر ایک پست قامت آدمی کی طرف متوجہ ہُوا۔ "آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔"

پست قامت آدمی نے جواب دیا "نہیں! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں"

"مورتی کب تک تیار ہو جائے گی؟"

"بس اب تھوڑا سا کام رہتا ہے کوئی دو ہفتے لگیں گے۔"

"اچھا! نمسکار۔" اس کے جواب میں نمسکار کی تین آوازیں آئیں۔

پروہت کو آم کے درخت کے قریب سے گزرتا دیکھ کر مادھو دم بخود سا ہو کر درخت کے ساتھ چمٹ گیا۔ باقی تینوں مندر کے صحن کی ایک طرف چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

شنکر نے سوال کیا "آپ نے اب تک کتنی مورتیاں بنائی ہیں؟"

پست قد آدمی نے جواب دیا "کوئی دو سو۔"

"بھلا آپ کالی دیوی کی مورتی بھی بنا سکتے ہیں؟"

"رام نگر کے مندر میں کالی دیوی کی مورتی میں نے ہی تو بنائی تھی۔ راجہ نے مجھے ایک ہاتھی انعام دیا تھا۔"

"ہاتھی! اسے آپ کیا کرتے ہوں گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ مفت کی مصیبت تھی۔ میں نے پروہت کو دے دیا تھا۔"

گوپال نے کہا: "رام نگر میں کالی دیوی کا مندر بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں وہاں ہر سال کئی آدمیوں کا بلیدان دیا جاتا ہے۔"

"ہاں پہلے دن سات شودروں کا بلیدان دیا گیا تھا۔"

شنکر نے کہا "اب تک یہاں کالی دیوی کا مندر سونا پڑا ہے اور شودروں کی نسل اس قدر بڑھ رہی ہے کہ اگر ہر ہر روز بلیدان دیا جائے تو بھی ختم نہ ہوں۔ مورتی کے سامنے کبھی کبھی پشو دان دیا جاتا ہے اور بس۔"

ٹھنگنے قد کے آدمی نے کہا "میں نے سنا ہے کہ تمہارا سردار شودروں پر بہت مہربان ہے؟"

شنکر نے جواب دیا "جیسا راجہ ویسا سردار۔ بڑے پروہت نے کئی بار راجہ سے اس کی شکایت کی ہے لیکن وہ سنتا ہی نہیں۔"

"تو پھر یہ راج دیر تک نہیں رہے گا۔"

"آپ کو کیا بتاؤں! یہاں تو اچھوت اس قدر سر چڑھ گئے ہیں کہ ہم تنگ آ گئے ہیں۔ وہ جھیلوں میں نہاتے ہیں۔ دریا میں مچھلیاں پکڑتے ہیں اور اگر راہ چلتے کہیں ان کا سامنا ہو جائے تو مجال کیا کہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو جائیں ہمیں خود ہٹنا پڑتا ہے۔"

گوپال نے کہا "بھوشن جی! اس میں نہ راجہ کا قصور ہے اور نہ سردار کا۔ یہ علاقہ فتح کیے ہمیں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ شروع شروع میں ان کے ساتھ سختی کی گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دور دور کے پہاڑوں میں چھپ چھپ کر ہمارے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ راجہ کی فوجوں کا بہت نقصان ہوا۔ پہلے سردار نے ان پر سختیاں کر کے وہ کامیابی حاصل نہیں کی جو رام داس نے نرمی سے حاصل کی ہے۔ انہوں نے شودروں کا سا سلوک کرنے سے پہلے انہیں شودر بنا لینا ضروری سمجھا۔ سردار رام داس کے سلوک سے یہ لوگ اب بھول چکے ہیں کہ یہ ہمارے غلام ہیں اور آہستہ آہستہ شودر بنتے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک ان میں کسی حد

تک بغاوت کا جذبہ موجود ہے۔ اگر آج ہی ہم ان کے ساتھ سختی شروع کر دیں تو وہ ہمیں دشمن سمجھ کر اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کیا دشمن کو جگا کر اس کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے اسے سلا کر اس کا گلا گھونٹ دینا آسان نہیں؟"

"تم درست کہتے ہو" پست قد کے آدمی نے جواب دیا۔

"شنکر! سو گئے؟" گوپال نے پوچھا۔

شنکر کو گوپال کی باتوں سے عام طور پر نیند آ جایا کرتی تھی۔ وہ خرّاٹے لے رہا تھا۔

اس گفتگو نے مادھو کی کتاب زندگی کا ایک نیا ورق الٹ دیا۔ دنیا اس کے سامنے ایک وسیع جھیل تھی۔ جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل رہی تھیں اس نے محسوس کیا کہ لوگ دنیا میں بھگوان کی مرضی پوری کرنے کی بجائے اس کے نام کی آڑ لے کر دنیا کے کمزور انسانوں پر ایک دائمی تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سب کو بنانے والا بھگوان ایک پر مہربان اور دوسرے کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ کیا اس کے بادل سب پر نہیں برستے۔ اس کی ہوائیں سب تک نہیں پہنچتیں کیا اس کا سورج سب کو روشنی نہیں پہنچاتا اور اس کی زمین سب کے لیے اناج اور پھل کے خفیہ خزانے نہیں اگلتی۔ بھگوان برا نہیں، وہ ہمارا دشمن نہیں۔ یہ لوگ تلواروں اور نیزوں کے علاوہ مکر و فریب کے خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں! ہم ان کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں۔ میں بھگوان کی پوجا کروں گا۔ میں بھگوان کا اوتار بنوں گا۔"

مادھو دیر تک وہاں کھڑا رہا اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ مندر کے نگہبان سو چکے ہیں۔ تو وہ زمین پر ہاتھ ٹیک کر ایک چوپائے کی طرح آہستہ آہستہ

چلتا ہوا مندر کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں ایک پتھر کی نامکمل مورتی اور ان اوزاروں
پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اور مندر میں داخل ہو کر بھگوان کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ
کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دبی زبان سے کہہ رہا تھا:

"بھگوان! میں تیرا اوتار بننا چاہتا ہوں۔ کیا تو شودروں سے نفرت کرتا
ہے۔ کیا تو نے ہمیں نہیں بنایا؟ بھگوان! بھگوان!!

مادھو مورتی کے پاؤں پر گر کر سسکیاں لینے لگا۔

باہر درخت پر چمگادڑ کے پھڑ پھڑانے کی آہٹ سن کر مادھو خوف زدہ
ہو کر اٹھا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مندر کے نگہبانوں کے خراٹے
ان کی بے خبری کا پتہ دے رہے تھے۔ مادھو واپس مڑ کر پھر مورتی کی طرف متوجہ ہوا
اور دبی زبان میں کہنے لگا: "بھگوان! تیرے مندر کے دروازے میرے لیے بند ہیں
لیکن میں تیری پوجا کرنا چاہتا ہوں۔ تیرا اوتار بننا چاہتا ہوں۔ اگر تیرے پجاری میرا
راستہ نہ روکتے تو میں ہر روز یہاں آتا۔ تجھے بنسری سناتا۔ تیرے لیے بھجن گاتا۔
جھیل کے صاف پانی سے کنول کے بڑے بڑے پھول لا کر تیرے پاؤں میں ڈھیر
کرتا۔" یہاں تک کہہ کر مادھو کو ایک خیال آیا۔ اور اس کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے
لگیں۔ "تیرے ہاتھ چکنی مٹی کی مورتی بنا سکتے ہیں۔ کیا تو ایک پتھر کی مورتی نہیں تراش
سکتا؟"

اس کی نگاہیں بھگوان کی مورتی کا طول و عرض ناپنے لگیں اور اس کے کانپتے
ہوئے ہاتھ مورتی کے جسم پر پھرنے لگے۔

"لیکن سفید پتھر؟" اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور تھوڑی دیر سوچنے
کے بعد اس نے خود ہی یہ جواب دیا: "دریا پر بہت ہیں۔"

---

(۳)

صبح کے وقت مندر کے برآمدے میں نامکمل مورتی کے پاس پڑے ہوئے
سنگ تراشی کے بہت سے اوزار غائب تھے۔ ٹھگنے سنگ تراش نے آسمان سر
پر اٹھا رکھا تھا۔ "وہ ہتھوڑا میں نے دلی سے خریدا تھا۔ وہ تیشہ میں نے بنارس سے
لیا تھا۔ اور فلاں فلاں اوزار میں نے فلاں فلاں جگہ سے لیے تھے اب مجھے پھر رام نگر
جانا پڑے گا۔ دہائی بھگوان کی! ارے بھگوان کے مندر میں چوری!!"

دوسری طرف شنکر، گوپال کو اور گوپال شنکر کو برا بھلا کہہ رہا تھا: "تم ایک
گدھے کی نیند سوتے ہو؟"

"تمہارے خراٹوں سے مینڈک کی سی آواز نکلتی ہے۔"

بالآخر دونوں نے فیصلہ کیا کہ "رات کے وقت یہاں کوئی نہیں آیا۔"

ٹھگنے سنگ تراش نے غصے سے ایڑیاں اوپر اٹھاتے، دانت پیستے اور
اپنے سر پر دوہتڑ مارتے ہوئے کہا: "ضرور آیا ہے۔ شام تک میرے اوزار یہیں تھے
اگر کوئی نہیں آیا تو میرے چور تم ہو۔ میں پروہت کے پاس جاؤں گا۔ میں سردار کے
پاس جاؤں گا۔ میں راجہ کے پاس جاؤں گا.... میں... میں...؟"

گوپال اور شنکر حیران تھے کہ یہ وہی ہے جو دوسروں کو ہاتھی دان کیا کرتا ہے!

دوپہر کے وقت شہر میں سردار رام داس کے سامنے پروہت، شنکر، گوپال
اور سنگ تراش اپنی بدحواسیوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

سنگ تراش اپنی کھوئی ہوئی دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شنکر شودروں
کے خلاف حکومت کی طرف سے سخت کارروائی کا مطالبہ کر رہا تھا۔

پروہت اپنے مندر کے پجاریوں کو بچانا چاہتا تھا۔ رام داس کو حکومت

کی بدنامی کا خوف تھا وہ شودروں کے متعلق شنکر کی باتوں سے پیدا ہونے والے شکوک رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گوپال اب تک خاموش کھڑا تھا۔ رام داس نے پوچھا "کیوں گوپال! تمہارا کیا خیال ہے؟"

گوپال اس واقعہ پر شنکر اور پروہت کی طرح پریشان نہ تھا۔ مندر میں چوری بے شک ایک برا فعل تھا لیکن گوپال کو اس بات کی خوشی تھی کہ سنگ تراش کو ہاتھی دان کرنے کے متعلق گپیں ہانکنے کی سزا ملی ہے اب اس کے لیے سنگ تراش سے تمام گالیوں کا بدلہ لینے کا موقع تھا اس نے جواب دیا "بھگوان نے جو عقل آپ کو دی ہے ہم اُن تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جو کچھ ہُوا بھگوان کی مرضی سے ہُوا۔ بھگوان چور بھی بھیج سکتا ہے اور دھرتی ماتا کو بھی اس کے اوزار غائب کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس کے اوزار دھرتی ماتا نے غائب کیے ہیں شاید اس لیے کہ جو مورتی یہ بنانا چاہتا ہے وہ بھگوان کو پسند نہ تھی اور یا شاید اس لیے کہ اس نے بھگوان کے مندر میں ہم سے بہت جھوٹ بولا تھا اور اسے اس جھوٹ کی سزا ملی ہے۔"

سنگ تراش نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا: "جھوٹ! جھوٹ!! ارے پاپی! میں نے تم سے کیا جھوٹ بولا ہے؟"

گوپال نے جواب دیا "ٹھہرو! میں بتاتا ہوں۔ ہاں پروہت جی! میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں اس کی عمر کیا ہو گی؟"

پروہت نے سنگ تراش کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "کوئی ساٹھ برس۔"

سنگ تراش نے بگڑ کر کہا: "ساٹھ نہیں پچاس بلکہ دو مہینے کم۔"

گوپال نے پروہت سے دوسرا سوال کیا "کیوں پروہت جی! رام نگر میں کالی دیوی کا مندر کب بنا تھا؟"

پروہت نے جواب دیا "اسے صدیاں ہو گئیں۔"

"اور مورتی کو؟"

"وہ بھی بہت پرانی ہے۔"

"یہ کہتا ہے کہ کالی دیوی کی مورتی میں نے بنائی ہے اور اسے ایک ہاتھی انعام ملا تھا۔"

"یہ بکتا ہے، یہ بکتا ہے۔" سنگ تراش نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

گوپال نے کہا "مہاراج! آپ شنکر سے پوچھ لیجیے۔"

رام داس نے پوچھا "کیوں شنکر؟"

عام حالات میں شنکر گوپال کی تائید میں کبھی گواہی نہ دیتا لیکن اس کے دل پر سنگ تراش کی گالیوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔ اس نے جواب دیا "صرف رام نگر کی کالی دیوی ہی نہیں سرکار۔ یہ تو کہتا تھا کہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے مندروں کی مورتیاں میں نے بنائی ہیں اور راجوں اور مہاراجوں نے مجھے اتنے ہاتھی دیے ہیں کہ میرے گھر انہیں باندھنے کی جگہ نہیں اور میں نے انہیں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے پروہتوں کو دان کر دیا ہے۔"

اب پروہت کی باری تھی اس نے ہنستے ہوئے کہا "مجھے تو اس نے بکری کا بچہ بھی نہیں دیا۔"

سنگ تراش کی ایڑیاں زمین سے اُٹھ چکی تھیں اور اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "یہ پاپ ہے! ــــ یہ اندھیر ہے!! میرے اوزار ان بدمعاشوں نے ہی چرائے ہیں میں ان سے بدلہ لوں گا میں راجہ

کے پاس جاؤں گا۔"

رام داس نے اپنی جیب سے سونے کے تین سکّے نکالتے ہوئے سنگ تراش کے سامنے پھینک دیے اور کہا: "یہ لو! اور بھاگو یہاں سے۔ ہمیں تمہاری بنائی ہوئی مورتی کی بھی ضرورت نہیں۔"

سنگ تراش نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سکّے اٹھائے اور باہر نکل آیا۔

پروہت، شنکر اور گوپال کے سر سے گویا بلا ٹل گئی۔

مندر کی طرف واپس جاتے ہوئے گوپال نے شنکر سے کہا "شاباش بیٹا! جھوٹ بولنا تمہارا ہی حصہ ہے۔ خوب گت بنائی اس الّو کی!"

شام کے وقت رام داس نے گوپال کو بلا بھیجا۔ جب وہ شہر سے واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک گائے تھی اس نے شنکر کو دور سے آواز دی۔ "بیٹا شنکر! سردار نے مجھے دان کیا ہے۔ تم دودھ اور مکھن میں میرے حصّہ دار ہو صرف گھاس لانا پڑے گی۔"

شنکر کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

---

(۴)

شام کے وقت ارجن نے کھانا کھاتے ہوئے ساوتری سے کہا "تم نے سنا گزشتہ رات کسی نے مندر سے سنگ تراش کے اوزار چرا لیے ہیں!"

ساوتری نے حیران ہو کر کہا "بھگوان کے مندر میں چوری! بھلا ایسا پاپ کون کر سکتا ہے؟"

"یہ کسی شودر کا کام ہو سکتا ہے۔"

موہنی کا ماتھا ٹھنکا وہ ارجن کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "پتاجی چور کا کچھ پتہ نہیں لگا؟"

"بیٹی تلاش ہو رہی ہے اگر چور پکڑا گیا تو بہت بڑی سزا دی جائے گی اسے۔"

"کیسی سزا پتاجی؟"

"میرے خیال میں اس کا بلیدان دیا جائے گا۔"

"اگر کوئی اونچی ذات کا ہوا تو بھی؟"

"پگلی کہیں کی۔ بھلا اونچی ذات کا آدمی مندر میں چوری کر سکتا ہے؟ یہ کسی شودر کا کام ہے۔"

موہنی خاموش ہو گئی اور ارجن اور ساوتری کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئے۔ موہنی دیر تک جاگتی رہی اسے بار بار مادھو کا خیال آ رہا تھا اور وہ ہر بار اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے رہی تھی کہ مادھو ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ بھگوان کرے کہ اس نے ایسا نہ کیا ہو۔" آدھی رات کے بعد نیند نے اس کے خیالات سپنوں میں تبدیل کر دیے ــــ وہ جھیل کے کنارے مادھو سے باتیں کر رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا: "موہنی میں ایک بہت بڑا بھگوان بنا رہا ہوں۔ بالکل تمہارے بھگوان جیسا مجھے پتھر تراشنے کے اوزار مل گئے ہیں۔"

اور وہ کہہ رہی تھی "مادھو! یہ اوزار چھپا دو۔ وہ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے اور تمہارا بلیدان دیا جائے گا۔"

جھاڑیوں میں سے سردار کے سپاہی نمودار ہوتے۔ اور مادھو کو پکڑ کر لے گئے۔ موہنی ان کی منتیں کر رہی تھی "اسے چھوڑ دو اس کا کوئی قصور نہیں۔" وہ

اسے کالی دیوی کی مورتی کے سامنے لے گئے۔ کالی دیوی کی خوفناک شکل دیکھ کر موہنی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ساوتری گھبرا کر اٹھی اور اس نے آواز دی "کیا ہے موہنی؟"

موہنی نے خوف سے کانپتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں ماتا!"

"بیٹی ڈر لگتا ہے تو آکر میرے پاس لیٹ جاؤ۔"

موہنی نے جواب دیا نہیں ماتا۔ اب صبح ہو رہی ہے۔ میں بھگوان کی پوجا کروں گی۔"

ارجن کے مکان کا ایک کمرہ پوجا پاٹ کے لیے وقف تھا۔ موہنی اٹھی اور ہاتھ منہ دھو کر سنگ مرمر کی ایک مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی اس نے میٹھی آواز میں چند بھجن گائے اور پھر درد بھرے دل سے دعا کی "بھگوان تو جانتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ اسے تیرا نام بھی معلوم نہ تھا۔ یہ سب کچھ ہم نے اسے بتایا ہم نے اسے مندر کا راستہ دکھایا۔ بھگوان! وہ سچے دل سے تجھ سے پریم کرتا ہے اور تجھ سے پریم کرنا پاپ نہیں۔ کیا تو نے اسے پیدا نہیں کیا؟ وہ جس دماغ سے تیرے متعلق سوچتا ہے جن ہاتھوں سے تیری مورتیاں بناتا ہے۔ جس زبان سے تیرے لیے بھجن گاتا ہے اور جس دل سے تجھے پریم کرتا ہے سب تیرے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تو اپنے بنائے ہوئے انسانوں کے پریم کا جواب نفرت سے دے اور پھر اس کی صورت بھی تو ایسی نہیں کہ اسے بنانے والا اس سے نفرت کر سکے۔"

موہنی کی آنکھوں میں مادھو کی صورت پھرنے لگی۔ اس نے صبح کی دھندلی روشنی میں مورتی کی طرف دیکھا اور مادھو کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے لگی۔ سنگ مرمر کی بے جان مورتی میں ایک پُراسرار ہیبت کے سوا کچھ نہ تھا اس کے مقابلے

میں مادھو کے خدوخال کی رعنائی اور دل فریبی کہیں زیادہ تھی۔ مورتی کی بے حس اور پُرسکون آنکھوں کے مقابلے میں اسے مادھو کی سیاہ اور چمک دار آنکھوں کی گہرائی میں زندگی کی ایک خوش گوار جھلک نظر آئی۔ بار بار التجاؤں کے جواب میں مورتی کی پُراسرار خاموشی پر اس کا دل بیٹھ چکا تھا۔ اس کی گرم اور تیز سانس ٹھنڈی آہوں میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن مادھو کے تصور نے اس کی مردہ رگوں میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔

وہ اس مقدس مورتی کے چرنوں سے دوران دل فریب فضاؤں میں پرواز کر رہی تھی جہاں پانی میں لہریں اٹھتی تھیں۔ پھول کھلتے تھے، درخت جھومتے تھے اور بنسری کے سُروں سے تانیں نکلتی تھیں جہاں زندگی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ موجود تھی۔ جہاں ہر سطح کے نیچے ایک گہرائی تھی۔ وہ گہرائی جس میں غوطہ لگانے والے کبھی نہیں تھکتے۔ یہ مورتی اپنی عظمت اور تقدیس کے باوجود ایک چمکتی ہوئی سفید سطح کے سوا کچھ نہ تھی۔ اپنی پجارن کی آنکھوں میں تشنگی، اس کی آواز میں سوز اور اس کے دل میں تڑپ پیدا کرنے سے معذور تھی۔ موہنی نے بارہا اپنے منتشر خیالات کو سمیٹ کر بھگوان کی مقدس مورتی کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کی لیکن اسے اپنی بے بسی کا اعتراف کرنا پڑا اس نے بھگوان کی مورتی کے پاؤں میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

"بھگوان! میری رکھشا کرو۔ وہ ایک شودر ہے مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں اس سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ میں جھیل پر کبھی نہ جاؤں گی۔ اسے سزا ملنے پر مجھے کبھی دکھ نہ ہوگا۔"

مادھو کی صورت پھر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ اس کی بنسری کی تانیں پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگیں وہ پوچھ رہا تھا "موہنی تمہیں سچ مچ میرے ساتھ

کوئی ہمدردی نہیں اگر میرا بلیدان دیا گیا تو؟"

موہنی نے گھبرا کر سر اٹھایا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "بھگوان! میں نے جھوٹ بولا۔میں نے جھوٹ بولا میں بے بس ہوں اور وہ بے قصور ہے۔وہ صرف تیری پوجا کرنا چاہتا ہے۔اگر تو سچ مچ بھگوان ہے تو اس کی مدد کر۔"

یہاں تک کہنے کے بعد موہنی اچانک گھبرا اٹھی۔اس کے دل نے احتجاج کیا۔ سچ مچ بھگوان! یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔" کیا تجھے اس کے بھگوان ہونے میں شک ہے؟"

موہنی فوراً اس سوال کا جواب نہ دے سکی وہ ٹکٹکی باندھ کر مورتی کی طرف دیکھنے لگی صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے کی ہیبت کم ہو رہی تھی۔

کیا یہ مورتی۔یہ تراشا ہوا پتھر بھگوان ہو سکتا ہے —— ! کیا یہ تمہاری آواز سن سکتا ہے؟ تمہارے دل کے بھید جان سکتا ہے؟ .... کیا اسی نے ساری دنیا کو بنایا ہے؟"

موہنی ان سوالات کا جواب سوچنے سے گھبراتی تھی۔وہ انتہائی پریشانی کی حالت میں کمرے سے باہر نکلی۔صحن میں آم کے درخت پر ایک کوئل "کوہو کوہو" کے نغمے الاپ رہی تھی۔ارجن باہر جا چکا تھا اور ساوتری گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔

موہنی دیر تک خاموش کھڑی کوئل کے نغمے سنتی رہی اور اس کے خیالات پھر ایک بار جھیل کے کنارے گھنے درختوں میں چکر لگانے لگے اور وہ خود فراموشی کی حالت میں آہستہ آہستہ کوئل کی کوہو کا جواب دینے لگی۔

ساوتری نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا "آج تجھے بھگوان کی پوجا کرتے دیکھ

کر تیرے پتا جی بہت خوش ہوئے۔تیرا سر بھگوان کے قدموں میں دیکھ کر انہوں نے کہا۔میری بیٹی! اب سیانی ہو گئی ہے۔بیٹی رات کیا خواب دیکھا تھا تو نے؟"

"ماتا مجھے یاد نہیں مجھے کسی بات سے ڈر لگا تھا۔"

باہر کے دروازہ سے رندھیر نے دو تین مرتبہ اندر جھانکا لیکن جب موہنی اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو وہ اندر چلا آیا۔اس نے کہا "موہنی چیتے کا بچہ دیکھو گی؟"

"کہاں؟"

"ہمارے گھر ایک شکاری رات کو پکڑ لایا تھا۔"

ساوتری نے کہا "بیٹی! دودھ پی کر جانا۔"

موہنی رندھیر سے تنہائی میں کچھ کہنے کے لیے بے قرار تھی وہ بولی "میں ابھی آتی ہوں ماتا!"

مکان سے باہر نکل کر موہنی نے رندھیر کی طرف مغموم نگاہوں سے دیکھا رندھیر موہنی کے چہرے سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگانے کا عادی تھا۔ اس نے پوچھا۔موہنا تم کچھ اداس سی ہو کیا بات ہے؟"

"رندھیر میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں خفا تو نہ ہو جاؤ گے؟"

"میں اور تم سے خفا! کہو کیا ہے؟"

"تم نے مندر کی چوری کے متعلق سنا؟"

"جب پجاری اور پروہت شکایت لے کر آئے میں گھر پر تھا۔"

"رندھیر اگر چور پکڑا گیا تو کیا تمہارے پتا اسے سزا دیں گے؟"

"ضرور دیں گے۔مندر کے چور کو کون معاف کر سکتا ہے؟"

موہنی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "رندھیر! اگر یہ اوزار کسی نے بھگوان کی مورتی تراش کر اس کی پوجا کرنے کے لیے چرائے ہوں تو بھی اسے سزا ملے گی؟"

رندھیر نے حیران ہو کر کہا: "موہنا! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

موہنی بولی: "رندھیر تمہیں یاد ہے مادھو کو بھگوان کی مورتی بنانے کا شوق تھا!"

رندھیر گہری سوچ میں موہنی کی طرف دیکھنے لگا۔ موہنی پھر بولی: "رندھیر! اگر ہم اسے اس دن مندر میں نہ لے جاتے تو یہ بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ اب اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر اس کے پاس کسی نے یہ اوزار دیکھ لیے تو وہ پکڑا جائیگا لیکن تم اسے بچا سکتے ہو۔ تم جھیل کی طرف جاؤ اس سے پوچھو اگر اس نے یہ اوزار چرائے ہیں تو اس سے کہو کہ انہیں کہیں چھپا دے۔"

اگر رندھیر کو ایک شودر کے ساتھ ہمدردی نہ بھی ہوتی تو بھی موہنی کا اشارہ اس کے لیے حکم تھا اس نے موہنی کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "میں ابھی جاتا ہوں۔ گھر سے گھوڑا لے آؤں۔ چلو تم وہاں چلیں۔ دیکھو میں ابھی واپس آجاؤں گا۔"

موہنی نے جواب دیا "نہیں جب جھیل سے واپس آؤ گے تو مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔"

---

(۵)

شانتا جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی کنول کے پھول کی پتیاں توڑ توڑ کر پانی میں پھینک رہی تھی اس کے آس پاس بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔ درختوں کے پیچھے سے بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپ سُن کر بکریاں بدحواس ہو کر اس طرف دیکھنے اور بھیڑیں اپنی مادری زبان میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھانے لگیں۔ شانتا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رندھیر کا گھوڑا درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور بکریاں

اور بھیڑیں خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئیں۔ سوار نے پوری طاقت سے گھوڑے کی لگام کھینچی لیکن سرکش گھوڑا رکتے رُکتے پانی کے کنارے پہنچ گیا۔ شانتا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔ پتھر سے پاؤں ٹکرایا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیٹھ کے بل پانی میں جا گری۔ رندھیر نے گھوڑے سے اُتر کر پانی میں چھلانگ لگا دی اور شانتا کا بازو پکڑ کر اُوپر اٹھاتے ہوئے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ یہ گھوڑا بہت سرکش ہے میں پہلی بار اس پر سوار ہوا تھا تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

شانتا نے رندھیر جیسے خوش وضع نوجوان کو تصور میں بھی اپنے اس قدر قریب نہ دیکھا تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ رندھیر کی طرف اُس کی نگاہیں جھک جھک کر اٹھیں اور اٹھ اٹھ کر جھکیں۔ دل کی دھڑکن اور سانس کی رفتار کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوئی۔ پانی سے باہر نکل کر رندھیر نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور پھر تسلی دیتے ہوئے کہا "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

شانتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "نہیں، آپ خواہ مخواہ پانی میں کُود پڑے۔"

رندھیر ایک اچھوت کو چُھو چکا تھا۔ اس کا مسکراتا ہُوا نہ بھولنے والا چہرہ دیکھ چکا تھا۔ اس کی آواز کانوں کے پردے چیرتی ہوئی اس کے دل کی آخری گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔ تاہم ندامت سے زیادہ وہ اپنے دل کی دھڑکن کو محسوس کر رہا تھا۔

"شانتا!" جواب دینے کی بجائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے پہلی بار اپنے نام میں کوئی خوبی نظر آئی۔ وہ بار بار رندھیر کے منہ سے اپنا نام سننا چاہتی تھی۔

رندھیر نے پھر کہا "شانتا! تمہارا نام شانتا ہے نا؟"

شانتا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو شانتا! میں ایک ضروری کام کے لیے آیا ہوں تمہارا بھائی کہاں ہے؟"
شانتا نے جواب دیا "وہ . . . لیکن اس نے کہا تھا میں کسی کو اس کا پتہ نہ بتاؤں۔"

شانتا یہ کہنے کے بعد غیر ارادی طور پر اپنے دائیں طرف گھنے درختوں کو دیکھنے لگی۔

"اس نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں آؤں تو بھی اس کا پتہ نہ بتانا؟"

"نہیں! آپ کو اور موہنی کو تو وہ بہت یاد کرتا ہے۔"

"تو پھر تم مجھے اس کا پتہ نہ بتاؤ گی؟"

شانتا سوچ میں پڑ گئی۔

رندھیر نے مسکراتے ہوئے کہا "اچھا نہ بتاؤ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے"

"نہیں! تم نہیں جانتے۔" شانتا مسکراتے ہوئے پھر گھنے درختوں کی طرف دیکھنے لگی۔

رندھیر نے کہا "وہ ان درختوں میں چھپا ہوا ہے۔"

شانتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"چچا مادھو شکار کے لیے گیا ہوا ہے اور آج میں اور بھیّا بکریاں چرا رہے ہیں۔ آپ کسی کو بتائیں نہیں۔ بھیّا ان درختوں میں چھپ کر پتھر کاٹ رہا ہے میں اسے بلاتی ہوں۔"

"نہیں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

رندھیر نے ایک درخت کے ساتھ گھوڑا باندھا اور شانتا کے ساتھ مادھو کی تلاش میں چل دیا۔ گھنے درختوں کی آپس میں پھنسی ہوئی ٹہنیوں اور

ان کے نیچے جنگلی بیلوں کی وجہ سے آگے بڑھنے کا راستہ ذرا دشوار تھا۔ رندھیر اور شانتا نے سخت جدوجہد کے بعد کچھ فاصلہ طے کیا۔ رندھیر نے پوچھا "ہمیں کتنی دور اور آگے جانا پڑے گا؟"

"بس جتنا ہم آگئے ہیں اس سے ذرا زیادہ۔"

"یہاں تو سانپ بھی ہوتے ہوں گے؟"

شانتا نے جواب دیا "سانپ بہت ہیں یہاں۔ آج ہی بھیّا نے ایک کالا سانپ مارا تھا ابھی آگے چل کر آپ کو دکھاتی ہوں۔ میں نے خود کئی سانپ مارے ہیں۔"

رندھیر فطرۃً بہت بہادر تھا لیکن سماج کی تربیت اس کے دل میں سانپ کی دشمنی سے زیادہ اس کا خوف و احترام پیدا کر چکی تھی۔ وہ قدرے خوف زدہ ہو کر شانتا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر اس نے ایک درخت کی ٹہنی توڑ کر ہاتھ میں پکڑ لی اور کہا "چلو! اب کوئی خطرہ نہیں۔"

شانتا نے کہا "میں تو سانپ کو ہاتھ سے پکڑ کر مار دیا کرتی ہوں۔" یہ ایک جھوٹ تھا لیکن شانتا کو یقین تھا کہ اگر آج سانپ نکل آئے تو وہ رندھیر کو اپنی بہادری دکھانے یا اس کی حفاظت کے لیے ایسے اقدام سے جھجک محسوس نہ کرے گی۔ ایک جگہ چند پتھروں کے درمیان ایک مُردہ سانپ دیکھ کر یہ تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے اور انہیں پتھر پر تیشے کی ضربوں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

شانتا نے کہا "بس اب ہم پہنچ گئے۔"

تھوڑی دور اور آگے چلنے پر تیشے کی ٹھکا ٹھک یک لخت بند ہو گئی شانتا نے رندھیر کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا "بھیا کو ڈرائیں تم شور نہ کرو۔"

شانتا احتیاط سے درختوں کی ٹہنیاں ادھر اُدھر ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی

اور رندھیر اس کی سادگی پر مسکراتا ہوا پیچھے ہو لیا۔

ایک تناور درخت کے نیچے پہنچ کر شانتا حیران سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کسی نے درخت کے نیچے بیل اور گھاس کاٹ کر تھوڑی سی جگہ بیٹھنے کے قابل بنا رکھی تھی۔ تراشے ہوئے پتھر کے چند ٹکڑے وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ شانتا نے بدحواس ہو کر رندھیر اور رندھیر نے پریشان سا ہو کر شانتا کی طرف دیکھا۔

بالآخر شانتا بولی۔ وہ یہیں تھا یہ کہہ کر شانتا زور سے آوازیں دینے لگی۔ "بھیا! بھیا! کہاں چلے گئے تم؟"

درخت کے اوپر سے ایک پُرزور قہقہے کی آواز آئی۔ اور مادھو درخت کی ٹہنیوں سے کود کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"موہنی بھی آئی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

مادھو کے منہ سے موہنی کا نام رندھیر کو پسند نہ آیا۔ اس نے جواب دیا "موہنی یہاں آ کر کیا کرتی؟"

مادھو نے کہا: "آپ نے یہاں آ کر بڑی دیا کی مجھے یہ امید نہ تھی کہ آپ ایسی جگہ مجھے تلاش کریں گے۔"

رندھیر نے کہا "مادھو! میں تم سے ایک ضروری بات کہنے آیا تھا۔"

"کہیئے!"

"تم ابھی یہاں کیا کر رہے تھے؟"

مادھو نے پریشان ہو کر شانتا کی طرف دیکھا اس کی سہمی ہوئی نگاہیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ اس کا بھید رندھیر پر ظاہر کر چکی ہے۔

رندھیر نے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا: "ڈرو نہیں! تم جو کچھ کر رہے تھے، مجھے معلوم ہے۔ ۔ ۔ ۔ تم مورتی تراش رہے تھے اور پتھر تراشنے کے اوزار تم

نے مندر سے لیے ہیں!"

مادھو نے جواب دیا "رندھیر! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم خفا ہو جاؤ گے۔"

رندھیر نے کہا "میں تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ تمہاری جان ہر وقت خطرے میں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور اسی لیے میں یہاں چھپ کر یہ کام کر رہا ہوں۔"

مادھو نے درخت کے قریب ایک بیل اٹھا کر ایک طرف کی اور بولا "یہ دیکھو: میں نے تمہارے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی یہ سب کچھ چھپا دیا تھا۔"

رندھیر نے بیل کے نیچے ایک پتھر اور سنگ تراشی کے اوزار دیکھ کر کہا: "تم بہت ہوشیار ہو موہنی کو تمہاری بہت فکر تھی اسی نے مجھے بھیجا تھا۔"

مادھو نے کہا: "رندھیر! میں حیران ہوں کہ تم اور موہنی شہر کے لوگوں سے کس قدر مختلف ہو، میں تمہارے احسان کا بدلہ کبھی نہ دے سکوں گا۔"

رندھیر نے جواب دیا "مادھو! ہم بھی حیران ہیں کہ تم دونوں شکل و صورت سے اچھوت نظر نہیں آتے۔"

رندھیر کے ان الفاظ سے مادھو نے غمگین ہو کر سر جھکا لیا لیکن شانتا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

رندھیر نے کہا: "اچھا! اب میں جاتا ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"چلو، میں تمہیں جھیل تک چھوڑ آؤں۔" مادھو نے پتھر اور اوزار پھر بیل کے نیچے چھپا دیے اور رندھیر اور شانتا کے آگے آگے چل دیا۔

جھیل کے کنارے گھوڑا دیکھ کر مادھو نے پوچھا "یہ کون چھوڑ گیا؟"

"یہ میرا ہے۔" رندھیر نے جواب دیا۔

مادھو نے کہا "رندھیر! جھیل میں نہاؤ گے نہیں؟"

رندھیر کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی لیکن شانتا کی موجودگی نے مادھو کی درخواست کو قابلِ قبول بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد چھوت اور اچھوت ایک ہی جھیل کے پانی میں نہا رہے تھے۔ شہر کا بہترین تیراک ہونے کے باوجود رندھیر کو مادھو قابلِ رشک نظر آ رہا تھا۔

جھیل سے نکلتے وقت دونوں نے کنول کے پھول توڑے۔ رندھیر نے اپنے پھول شانتا کو پیش کیے۔ مادھو نے اپنے پھول رندھیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم یہ لے جاؤ۔ موہنی کو دے دینا۔ اسے کنول کے پھول بہت پسند ہیں۔"

مادھو کے منہ سے پھر ایک بار موہنی کا نام سن کر رندھیر نے ایک تلخی سی محسوس کی لیکن شانتا کے سامنے وہ اس کے پھول لینے سے انکار نہ کر سکا۔

---

(۷)

رندھیر گھوڑا بھگاتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ موہنی اپنے مکان سے باہر ایک درخت کے نیچے کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی وہ اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور موہنی کو چھیڑنے کی نیت سے مغموم سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ موہنی کا چہرہ یکایک زرد پڑ گیا۔

"کیا ہوا رندھیر؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"موہنی غضب ہو گیا وہ پکڑا گیا؟"

موہنی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی "رندھیر! اسے بچاؤ۔ بھگوان کے لیے اسے

بچاؤ وہ بے قصور ہے۔"

موہنی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

رندھیر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ موہنی سراپا التجا بن کر رندھیر کے سامنے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی،

"رندھیر! بھگوان کے لیے مذاق نہ کرو۔ مجھے سچ سچ بتاؤ تم نے اسے دیکھا؟"

"ہاں! تم اس کی فکر نہ کرو۔ اسے کوئی خطرہ نہیں۔ چلو گھر چلیں۔"

"بتاؤ تو سہی کیا ہوا وہاں؟"

رندھیر نے جھیل کے تمام واقعات یکے بعد دیگرے بیان کرنے کے بعد کہا "لو یہ پھول"

موہنی نے اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے تو اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "موہنی! تم بھرشٹ ہو گئی ہو۔ یہ پھول مادھو نے توڑے تھے۔"

موہنی نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے کیا معلوم کس نے توڑے ہیں۔ اگر یہ اس نے توڑے ہیں تو بھی پاپ لا کر دینے والے کے سر ہو گا۔"

بدھو اور شنکر

قریباً چار مہینے کنول اور بدھو کو مادھو کی دل چسپیوں کا علم نہ ہُوا۔ سردی کے موسم میں جھیل کے آس پاس دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ کنارے پر گھاس سُوکھ چکی تھی۔ درختوں کے پتّے جھڑ چکے تھے اور کنول کے پھول جیسے کبھی تھے ہی نہیں لیکن مادھو دن میں ایک بار جھیل کی طرف ضرور جاتا۔

بدھو کو اپنی سادگی، ایثار اور خلوص کی بدولت آس پاس کی بستیوں کے لوگوں میں کافی عزت حاصل ہو چکی تھی۔ وہ ان کے ساتھ شکار کے لیے جاتا تو وہ اسے حتی الوسع دریا کے ٹھنڈے پانی میں اترنے سے منع کرتے اور اپنا شکار تقسیم کرتے وقت اس کا حصہ دوسروں سے زیادہ رکھتے۔ اُن کے جھگڑوں میں بدھو کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا۔

شکار کے موقعوں پر بدھو کی غیر حاضری میں بھیڑوں کی نگہداشت شانتا اور مادھو کے سپرد ہوتی اور مادھو کو سنگ تراشی کے لیے سارا دن مل جاتا لیکن کبھی کبھی بدھو اسے بھیڑیں چرانے اور مچھلیاں پکڑنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا۔ بدھو کو اپنی زندگی میں مادھو کے سر کوئی ذمہ داری تھوپنا گوارا نہ تھا لیکن وہ اسے ایک اچھا چرواہا اور بہترین شکاری دیکھنا چاہتا تھا اس کے نزدیک ایک نوجوان کی سب سے بڑی خوبیاں یہی تھیں۔ بنسری بجانے کے فن میں بدھو اُس کے کمال کا اعتراف کر چکا تھا لیکن اسے یہ شکایت تھی کہ مادھو مچھلی کے

شکار اور بھیڑیں چرانے سے بہت جلد اکتا کر بھاگ جاتا ہے۔

ایک شام اس نے کنول سے کہا "بہن! مادھو کا جی باہر بالکل نہیں لگتا۔ آخر وُہ گھر میں سارا دن کیا کرتا رہتا ہے؟"

کنول نے حیران ہو کر جواب دیا "گھر میں تو وہ شام سے پہلے کبھی نہیں آتا جس دن تم گھر چھوڑ جاتے ہو اس دن بھی وہ صبح سے شام تک کہیں غائب رہتا ہے۔"

"آخر کہاں جاتا ہے وُہ؟"

"میں اسے ہمیشہ جھیل کی طرف آتے جاتے دیکھتی ہُوں کبھی کبھی شانتا بھی اس کے ساتھ غائب ہو جاتی ہے۔ کیوں شانتا! کہاں جایا کرتے ہو تم دونو؟"

شانتا نے جواب دیا "کہیں بھی نہیں۔ جھیل پر راج ہنس کا ایک جوڑا رہتا ہے ہم انہیں دیکھا کرتے ہیں۔"

اتنے میں مادھو آپہنچا اور اسے دیکھتے ہی بدھو نے کہا "کیوں بیٹا! دیکھ آئے ہنس کا جوڑا؟"

مادھو نے پریشان ہو کر جواب دیا "ہنس کا جوڑا؟ وہ کہاں ہے؟"

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں ... میں جھیل ... جھیل پر گیا تھا چچا!"

"جھیل پر تمہارا کیا کام تھا؟"

"چچا! میں وہاں بنسری بجا رہا تھا۔ میں نے ایک نیا سُر نکالا ہے — سناؤں تمہیں؟"

"شانتا نے جلدی سے کہا "سناؤ بھیّا!"

مادھو نے بنسری ہونٹوں سے لگائی اور ایک دردناک راگ سے بدھو

قاعدہ پیار میں تبدیل کر دیا۔ تاہم اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مادھو اس سے کوئی بات چھپا رہا ہے۔ رات کو سوتے وقت اس نے مادھو سے کہا:۔

"مادھو! میں علی الصباح شکار کے لیے جا رہا ہوں تم بھیڑیں سنبھالنا۔"

صبح کے وقت بدھو کا بستر خالی دیکھ کر مادھو کو بہت خوشی ہوئی۔ اس نے شانتا کو جگا کر کہا: "شانتا! ماتا دودھ دوہ لیں تو بکریاں اور بھیڑیں لے کر جھیل پر آ جانا۔ میں وہیں ہوں گا۔"

شانتا نے رازدارانہ انداز میں سر ہلایا اور مادھو خوشی خوشی جھیل کی طرف روانہ ہو گیا گہری دھند میں چند قدم سے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے پہنچ کر مادھو نے چاروں طرف دیکھا اور اطمینان کا سانس لے کر گھنے درختوں میں گھس گیا۔ سردیوں میں اس کی منزل مقصود کا راستہ اس قدر دشوار گزار نہ تھا۔ سوکھی ہوئی گھاس اور مرجھاتی ہوئی ٹہنیوں کی مزاحمت بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ مادھو نے چلتے چلتے اپنے پیچھے کچھ کھٹکا محسوس کیا اور بدحواس ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب اسے کوئی متحرک شے نظر نہ آئی تو وہ اپنے وہم پر ہنستا ہُوا آگے چل دیا۔

درخت کے نیچے پہنچ کر اس نے سوکھی ہوئی بیل کو ایک طرف ہٹایا اور پتھر کی مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔ نوجوان سنگ تراش کی یہ کوشش کامیاب تھی مورتی مکمل ہو چکی تھی۔ صرف کہیں کہیں کھردری سطح کی صفائی کا کام باقی تھا۔

چھوٹے سے چہرے کے نقوش انسانی خدوخال کا بہترین نمونہ تھے۔ آنکھوں میں ایک پُراسرار ہیبت کی بجائے رحم، محبت اور عفو کی ایک غیر فانی جھلک تھی۔ مادھو نے ایک اوزار اٹھایا اور کھردرے حصوں کو کھرچ کر صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔

درخت کی ٹہنیوں سے شبنم کے قطرے گرنے لگے لیکن مادھو اپنے گردوپیش سے بے خبر اپنے کام میں محو تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مندر سے سیکھا ہُوا بھجن گانے لگا۔ اُس کے ہلکے سُر بتدریج بلند ہوتے گئے۔

اچانک مادھو! مادھو! کی آواز سن کر اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ سامنے بدھو کھڑا تھا۔

"چچا!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "تم شکار کے لیے نہیں گئے؟"

بدھو کسی اور دنیا میں تھا اس کے دل و دماغ کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ چکی تھیں اور وہ مُورتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مادھو مرعوب ہو کر پھر بولا "چچا! یہ بھگوان کی مُورتی ہے۔ اسے مَیں نے بنایا ہے . . . . چچا تم خفا ہو گئے ہو؟"

بدھو پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہ ہُوا وہ ایک ایسی چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا جس کے پاس پانی کی بے قرار موجوں کے تھپیڑوں کا جواب ایک حقارت آمیز خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا مادھو اٹھ کر آگے بڑھا اور بدھو کا بازو پکڑ کر اس کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"چچا! میں اسے تم سے چھپانا نہیں چاہتا تھا صرف اسے مکمل کر کے تمہیں دکھانا چاہتا تھا تم نے اسے پسند نہیں کیا؟"

بدھو نے ہاتھ جھٹک کر مادھو کو ایک طرف ہٹا دیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور مورتی کے قریب پڑا ہُوا تیشہ اٹھا کر اسے توڑنے کی کوشش کی لیکن مادھو نے "چچا! چچا!" کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی اور دوسرے ہاتھ سے تیشہ پکڑ لیا۔

چند لمحات کی کشمکش کے بعد مادھو نے بدھو کے ہاتھ سے تیشہ چھین کر

اسے پیچھے دھکیل دیا۔ بدھو کو پہلی بار اپنے بڑھاپے اور مادھو کی جوانی کا احساس ہُوا کبھی مادھو اور کبھی مورتی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ دونوں اس کی ہنسی اُڑا رہے ہیں وہ جیتے جی اعترافِ شکست کرنے والوں میں سے نہ تھا لیکن اس کا مدِمقابل وہ نوجوان تھا جس کی رگوں میں سکھدیو کا خون تھا اور یہ خون ایسا نہ تھا جو بدھو کے دل میں سُلگتی ہوئی آگ کے لیے پانی کا کام نہ دے سکتا۔ اس کی آنکھوں میں آگ کے انگارے آنسوؤں میں تبدیل ہونے لگے اور اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹا! اب تم مجھ سے طاقتور ہو گئے ہو تمہیں سمجھانا اب میرے بس میں نہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ بدھو کی آنکھوں سے وہ آنسو جنہیں وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، بہہ نکلے۔

مادھو کا دل پہلے ہی ندامت سے پسا جا رہا تھا وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا بے اختیار آگے بڑھا اور بدھو کے قدموں پر گر پڑا "چچا! مجھے معاف کر دو مجھے معاف کر دو۔"

بدھو کو گویا پھر ایک بار کھوئی ہُوئی بادشاہت مل گئی۔ اس نے مادھو کو اٹھا کر گلے لگا لیا "میرے بیٹے! میرے مادھو! میں آج بہت خوش ہُوں کہ تمہارے بازو اس قدر مضبوط ہیں تمہیں وہ دن یاد ہیں جب تم اپنے ننھے ہاتھوں سے میرے منہ پر طمانچے لگایا کرتے تھے اور میں تمہارے ہاتھ چُوما کرتا تھا۔ میرے لیے تم آج بھی وہی مادھو ہو۔"

بدھو یہ کہہ کر مادھو کے بازو ٹٹولنے لگا۔ مادھو نے پُرنم آنکھیں اوپر اُٹھائیں بدھو کے لیے اس کے چہرے پر غم کے ہلکے سے آثار بھی بارِ خاطر تھے۔ اس نے چہرے پر مغموم مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"بیٹا! تم خیال کرتے ہو گے کہ میں تمہارا دشمن ہوں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ میں سکھدیو کے بیٹے کو آگ میں کُودتا دیکھوں اور خاموش رہوں۔"

"چچا! میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا میں نے مورتی بنائی ہے۔ اُس بھگوان کی مورتی جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے ہیں۔"

بدھو بولا۔ "وہ رامو بھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا اس نے بھی ایک مُورتی بنائی تھی لیکن اسے حکومت کی ہوس تھی۔ وہ مٹی کی مورتی کو پھندا بنا کر آدمیوں کا شکار کھیلنا چاہتا تھا لوگوں کو مورتی کا خوف دلا کر انہیں اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ وہ دیوتاؤں سے وہی کام لینا چاہتا تھا جو اونچی ذات والے نیچ ذات والوں کے حقوق چھیننے کے لیے لیا کرتے ہیں اس کا پہلا شکار تمہارا باپ تھا لیکن مادھو! میں تمہیں رامو نہیں بننے دوں گا۔"

مادھو نے پریشان ہو کر جواب دیا "لیکن چچا! میں کسی کو غلام نہیں بنانا چاہتا میرا بھگوان اونچی ذات والوں کا بھگوان نہیں جو کسی سے نفرت اور کسی سے محبّت کرتا ہے۔ میں بھگوان اُسے کہتا ہوں جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جس کے بنائے ہوئے چاند اور سُورج کی روشنی ہر گھر میں پہنچتی ہے جس کے بھیجے ہوئے بادل ہر کھیت پر برستے ہیں جس کے حکم سے چلنے والی ہواؤں میں ہم سب یکساں طور پر سانس لیتے ہیں جس کی زمین ہر ایک کے لیے اناج اور پھل پیدا کرتی ہے جو ہر ایک سے محبت اور ہر ایک سے انصاف کرتا ہے کیا ہمارا فرض نہیں کہ ایسے بھگوان کی مورتی بنائیں اور اس کی پوجا کریں!"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پتھر کا یہ بے جان ٹکڑا جسے کل تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں پڑا ہُوا ہے۔ آج تمہارے تیشے کی ضربوں سے کیوں کر اس قابل بن گیا ہے کہ ہم اس کی پوجا کریں۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ بھگوان وہ ہے جس نے سورج اور چاند کو بنایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جس نے ایسی چیزیں بنائی ہیں وہ خود کیسا

ہوگا۔ کیا اس تراشے ہوئے پتھر کو اس کے ساتھ کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟"

مادھو نے جواب دیا "چچا! یہ تو اس کی مورتی ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہ بھگوان ہے جب تک اس کی کوئی صورت ہمارے سامنے نہ ہو۔ ہم اس کی پوجا کیسے کر سکتے ہیں؟"

"بیٹا! یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ صورت جو تم نے بنائی ہے بھگوان کی صورت نہیں ہو سکتی تمہاری اپنی صورت اس سے اچھی ہے۔ اور پھر اگر یہ ضروری ہے کہ پوجا کا شوق پیدا کرنے کے لیے تمہاری آنکھوں کے سامنے کوئی صورت موجود ہو تو کیا یہ مقصد صرف تراشے ہوئے پتھر ہی پورا کر سکتے ہیں۔ کیا چاند اور سورج کو دیکھ کر تمہارے دل میں بھگوان کی پوجا کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ کیا دنیا کے تمام سنگ تراش مل کر چاند اور سورج جیسی کوئی شے بنا سکتے ہیں؟

چاند اور سورج تو اس زمین سے دور ہیں۔ تم ہر روز مشرق کے اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھتے ہو جن کی چوٹیوں پر بارہ مہینے برف چمکتی ہے جن کے دامن میں سدا آبشاریں اور ندیاں بہتی ہیں۔ ان پہاڑوں سے پرے اور پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں آسمان سے ملی ہوئی ہیں اگر تم وہاں پہنچ جاؤ تو یہ محسوس کرو گے کہ تراشے ہوئے پتھروں کو بھگوان کی مورتیاں سمجھنے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں اگر تمہارا خیال ہے کہ بھگوان کسی ایسی طاقت کا نام ہے جس نے دنیا کی ہر شے کو بنایا ہے تو شوق سے اس کی پوجا کرو کوئی تمہیں منع نہیں کر سکتا۔ تمہارا پتا خود ایک زبردست اور انصاف پسند طاقت کو مانتا تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ رنگ رنگ کی چیزیں دیکھ کر تمہارے دل میں بھگوان کی پوجا کا شوق پیدا نہیں ہوتا تو اپنے ہاتھوں کی تراشی ہوئی مورتیاں تمہیں کیا دے سکتی ہیں؟"

---

(۲)

بدھو کی اس تقریر کے بعد مادھو نے محسوس کیا کہ وہ ایک گہرے خواب سے بیدار ہوا ہے۔ سادہ دل چرواہے کا ہر لفظ اس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر رہا تھا۔ مورتی کے تراشے ہوئے نقوش اس کی آنکھوں سے محو ہو رہے تھے اور وہ تصور میں دریا کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتھر کو دیکھ رہا تھا جو صدیوں سے بھگوان کی مقدس مورتی کی شکل میں تبدیل ہونے کے لیے کسی سنگ تراش کی نظرِ کرم کا محتاج تھا۔ مادھو نے اپنے دل سے سوال کیا "کیا تم طاقت کا تصور کر سکتے ہو جو زمین اور آسمان پر حکمران ہے؟ کیا ان تراشے ہوئے پتھروں کو اُس عظیم طاقت سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے؟"

یہ بات بدھو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس کی تقریر کا ہر لفظ مادھو کے تصورات کی حسین دنیا کو درہم برہم کر رہا ہے۔ وہ مادھو کی خاموشی کو ہٹ دھرمی اور ضد سے تعبیر کر رہا ہے۔ اس نے بددل سا ہو کر کہا:

"مادھو بیٹا! میں جانتا ہوں کہ تم پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا میں تمہیں منع نہیں کروں گا لیکن تم یہ کام یہاں رہ کر نہیں کر سکتے۔ ہمیں بہت جلد یہ ملک چھوڑنا پڑے گا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اونچی ذات والے نیچ ذات والوں کو ایسے کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو تمہاری سزا موت ہو گی۔"

مادھو نے جواب دیا: "چچا! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھگوان کے متعلق اتنا کچھ جانتے ہو لیکن میں کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ خود ایک دھوکے میں گرفتار تھا تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ پتھر کی مورتی مجھے صرف اس وقت تک بھگوان نظر آ سکتی تھی جب تک یہ آنکھیں بند تھیں۔ آج آنکھیں کھلنے پر میں محسوس کر رہا ہوں۔

کہ وہ ان نگاہوں کی رسائی سے بہت دُور ہے۔ ہم صرف اس کی بنائی ہوئی چیزوں سے اس کی عظمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو اس کی صورت میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ وہ ہر خوبصورت شے میں موجود ہے۔"

بدھو کا دل مسرت سے اچھل رہا تھا اس نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر مادھو کو گلے لگاتے ہوئے کہا:

"بیٹا! آج میں نے تمہیں کھو کر پایا ہے۔"

"لیکن چچا! سچ بتانا تم بھگوان کو مانتے ہو؟"

بدھو نے جواب دیا "میں ایک ایسی طاقت کو مانتا ہوں جس نے آسمان اور زمین کی ہر شے بنائی ہے۔ جس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا جو ہمیں ایک دوسرے سے محبت کا سبق دیتی ہے۔ رہے دیوتا، مورتیاں اور بھگوان، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ ہمارے دشمنوں کی زبان کے الفاظ ہیں جو ان کی آڑ لے کر ہمارا شکار کھیلتے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو مجھے ان سے نفرت ہے۔"

مادھو نے مسکراتے ہوئے کہا "چچا! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنی باتیں جانتے ہو"

بدھو بولا "سکھدیو بھی مجھے بے وقوف کہا کرتا تھا لیکن اس کی زندگی میں مجھے عقلمند بننے کی ضرورت نہ تھی جب میری راہ کا ہر کانٹا وہ دیکھا کرتا تھا۔ مجھے کانٹوں پر چلنے میں لطف آتا تھا اور اتنا بوجھ اٹھا کر میں ہر الٹی سیدھی راہ پر بے فکر ہو کر جا سکتا تھا لیکن اب مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے ہر راستے پر پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ میں بے سمجھ تھا لیکن سکھدیو کی موت نے مجھے سوچنا سکھا دیا۔ میں نڈر تھا لیکن تمہاری حفاظت کے خیال نے مجھے ڈرپوک بنا دیا۔ کاش! آج سکھدیو زندہ ہوتا اور اس بے سمجھ بدھو کو بھیڑیں چرانے، درختوں پر چڑھ کر

بنسری بجانے اور دریاؤں میں کودنے کے سوا کوئی کام نہ ہوتا۔"

بدھو کی آنکھوں میں پھر آنسو چمکنے لگے۔

مادھو نے زمین پر پڑا ہوا تیشہ اٹھایا اور بدھو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "چچا! یہ لو اس مورتی کو اپنے ہاتھ سے توڑ ڈالو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔"

بدھو نے تیشہ پکڑ لیا۔ کچھ سوچنے کے بعد مورتی کی طرف بڑھا اس نے مورتی توڑنے کی نیت سے دو دفعہ تیشہ بلند کیا لیکن مورتی تک پہنچتے پہنچتے اس کا ہاتھ خود بخود رک گیا اس نے مادھو کی طرف دیکھا اور کہا "مادھو! تم نے اس کے تراشنے میں کئی دن لگائے ہوں گے؟"

"ہاں چچا" اس نے جواب دیا۔

میں اسے نہیں توڑ سکتا۔ چلو اسے کہیں پھینک دیں۔"

"کہاں پھینکیں؟"

"جھیل میں۔ لیکن اس وقت انہیں کوئی دیکھ لے گا۔"

"چچا میں اسے شام کو پھینک دوں گا۔ چلو! اب گھر چلیں۔"

مادھو نے مورتی کو اٹھا کر سوکھی بیل کے نیچے چھپا دیا اور دونوں گھر کی طرف چل دیے۔

---

(۳)

اگلے روز شنکر علی الصباح اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا تو مندر کے دروازے کے سامنے ایک خوبصورت مورتی دکھائی دی۔ وہ دوسری کوٹھڑی میں جا کر گوپال

کو جگانے کی بجائے بھگوان کی جے! بھگوان کی جے!!" کے نعرے لگاتا ہُوا سیدھا مندر کی طرف بھاگا۔ گوپال ذرا دیر سے اٹھنے کا عادی تھا لیکن شنکر کو خطرہ تھا کہ اگر آج وہ معمول سے ذرا پہلے اٹھ بیٹھا تو شہر والوں تک یہ عجیب و غریب خبر پہنچانے میں خواہ مخواہ کا حصہ دار بن جائے گا اس لیے وہ ہر دس پندرہ قدم پر پیچھے دیکھتا اور اپنی رفتار تیز کر دیتا۔ شہر تک پہنچتے پہنچتے اسے سخت سردی کے باوجود پسینہ آ رہا تھا۔

شہر سے باہر نکلنے والے چند آدمیوں نے اسے روک کر اس بدحواسی کی وجہ پوچھنا چاہی لیکن وہ یہ قیمتی چیز سب سے پہلے شہر کے سردار کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا اس لیے وہ ہر پوچھنے والے کو کوئی تسلی بخش جواب دیے بغیر آگے نکل گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ کئی آدمی اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے کہہ رہے تھے: "شنکر ٹھہرو! شنکر کیا ہُوا ہے؟"۔

شہر میں داخل ہوتے ہی اسے سامنے سے رندھیر آتا ہُوا دکھائی دیا۔ لوگوں کی چیخ پکار اسے شنکر کی طرف متوجہ کر چکی تھی اس نے بھی آواز دی۔ "شنکر ٹھہرو!" لیکن شنکر نے کترا کر دوسری گلی سے نکلنے کی کوشش کی۔ رندھیر کو اس کی اس حرکت پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی اور اس نے بھاگ کر شنکر کو بازو سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

ارے تمہاری یہ حالت! آخر ہُوا کیا؟ کہیں چوری تو نہیں کی۔ آدھا شہر تمہارے پیچھے لگا ہُوا ہے؟"

شنکر بری طرح ہانپ رہا تھا۔ کچھ دیر اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ بالآخر اس نے کہا:

"بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو میں تمہارے پتا جی کے پاس جا رہا ہوں۔"

رندھیر نے جواب دیا۔ "جب تک مجھے نہیں بتاؤ گے میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔" اتنے میں بہت سے لوگ شنکر کے ارد گرد جمع ہو کر رندھیر کے مطالبہ کی تائید کر رہے تھے۔

شنکر نے سراسیمہ ہو کر چاروں طرف دیکھا اور مایوس ہو کر جواب دیا۔ "میں نے مندر میں بھگوان کی نئی مورتی دیکھی ہے جسے دیوتا خود بنا کر رات کے وقت وہاں رکھ گئے ہیں۔"

رندھیر نے شنکر کا بازو چھوڑ دیا لیکن اب دوسروں کی باری تھی۔ رندھیر کے ہاتھوں سے آزاد ہو کر اب وہ کئی ہاتھوں کی گرفت میں تھا اور کئی زبانیں اس سے مختلف سوالات پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں شنکر! وہ مورتی کیسی ہے۔ پتھر کی ہے یا تانبے کا۔ سونے کی ہو گی کتنی بڑی ہے۔ کب دیکھی تم نے؟"

شنکر نے مختصر سے جوابات سے انہیں ٹالنا چاہا لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ لوگوں کی تسلی کیے بغیر چھٹکارا ممکن نہیں۔ شنکر سے اپنے سوالات کا جواب پوچھنے والے مندر کا رُخ کرنے لگے لیکن ان سے زیادہ تعداد میں اور آموجود ہوئے۔ چنانچہ شنکر کو اپنا بیان کئی مرتبہ دہرانا پڑا۔ اتنے میں اسے گوپال سرپٹ بھاگتا ہُوا نظر آیا۔ اس نے لوگوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی آخری کوشش کی لیکن بے سُود۔

گوپال قریب پہنچا تو لوگوں نے اسے بھی ٹھہرانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے لوگوں کو ادھر اُدھر ہٹاتا ہُوا آگے گزر گیا۔

شنکر ہجوم کی گرفت سے اس وقت آزاد ہُوا جب کہ تمام لوگ ایک ایک کر کے مندر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ مردوں کے بعد عورتوں کی باری تھی

لیکن عورتیں ایسے معاملات کی تفصیل میں نہیں جاتیں۔ اس لیے وہ زیادہ دیر شنکر کا راستہ نہ روک سکیں۔

سردار اور پروہت کے مکانات پر جا کر شنکر کو معلوم ہُوا کہ گوپال ان کے کانوں تک یہ خبر پہنچا چکا ہے اور وہ مندر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔

شنکر دل برداشتہ ہو کر واپس مڑا۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ مندر کی طرف جانے والے مرد اور عورتیں پھر اس کے گرد جمع ہو جائیں اور اسی بے قراری کے ساتھ اس سے سوالات پوچھیں لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اب وہ کسی کی معلومات میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ کسی نے یہ اعتراف بھی نہ کیا کہ شہر میں سب سے پہلے یہ خبر لانے والا شنکر تھا۔ ہر شخص شنکر پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ نئی مورتی کے متعلق اس سے زیادہ جانتا ہے۔

تھوڑی دُور آگے چل کر اسے ایک بڑی ٹولی میں رام داس، پروہت اور گوپال نظر آئے وہ تھکی ہوئی ٹانگوں کے احتجاج کے باوجود بھاگ کر اس ٹولی میں آ شامل ہُوا لیکن اسے دیکھتے ہی رام داس نے سوال کیا: ”کیوں شنکر! تم نے بھی وہ مورتی دیکھی ہے؟“

شنکر کے سوال پر گویا کسی نے ٹھنڈے پانی کا مٹکا الٹ دیا۔ اس نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”سرکار! میں نے سُورج نکلنے سے بہت دیر پہلے یہ مورتی دیکھی تھی۔ دیوتا اسے مندر کے دروازے کے سامنے رکھ گئے ہیں ـــ“

شنکر کی مظلومیت میں اضافہ کرنے کے لیے گوپال بول اٹھا: ”مہاراج! میں نے مورتی مندر کے اندر دیکھی تھی اب شاید باہر آ گئی ہو۔“

پروہت نے کہا: ”مجھے شنکر کا اعتبار نہیں۔ یہ ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے“

شنکر نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں پر جو بوجھ پہلے تھا وہ اب دس گنا زیادہ ہو گیا ہے تاہم وہ حیران تھا کہ مورتی مندر کے اندر کیسے چلی گئی۔

مندر میں داخل ہو کر شنکر کو معلوم ہُوا کہ گوپال اس کے ساتھ بہت بڑی شرارت کر چکا ہے۔ نئی مورتی جسے اس نے دروازے سے باہر دیکھا تھا اب مندر کے اندر پہنچ چکی تھی۔

لوگوں نے نئی مورتی پر کھلے دل سے دولت نچھاور کی۔ پروہت نے بھجن گائے لیکن اس کارروائی کے دوران میں شنکر دل ہی دل میں رندھیر کو کوس رہا تھا اسے یقین ہو چکا تھا کہ دان کی تقسیم میں وہ گوپال کے ساتھ برابر کا حصہ دار نہیں ہو گا۔“

موہنی بھی مندر میں پہنچ چکی تھی اس نے مورتی کے قریب جا کر اسے دیکھا اور پھر لوگوں کی نگاہوں سے بچتی ہوئی رندھیر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

رندھیر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا ”موہنی! میں تمہیں ایک عجیب بات بتانا چاہتا ہوں۔“

”بتاؤ۔“

”یہاں نہیں۔ میں جھیل کے کنارے درختوں کے نیچے تمہارا انتظار کروں گا اگر مادھو کے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہو تو ضرور آنا۔ آؤ گی نا!“

موہنی کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی اس نے رندھیر کی نگاہوں سے بچنے کے لیے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا ”آؤں گی۔“

دوپہر کے وقت جب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے موہنی اپنی ماں اور سہیلیوں سے آنکھ بچا کر جھیل کے کنارے پہنچی۔ رندھیر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ موہنی نے اسے دیکھتے ہی کہا: ”دیکھو رندھیر! ہمارا اس طرح پھرنا

ٹھیک نہیں۔ جلدی کہو، کیا بات ہے؟"

رندھیر نے کہا "میں تمہیں کچھ بتانے سے پہلے اپنی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔"

"آخر کچھ بتاؤ گے بھی۔"

رندھیر نے کہا "موہنی! وہ مورتی شاید مادھو نے بنائی ہے۔"

موہنی نے بدحواس ہو کر کہا "مادھو نے؟ میں نہیں مانتی۔ وہ ایسی مُورتی نہیں بنا سکتا۔"

"چلو تمہیں کچھ دکھاؤں۔"

"کیا دکھاؤ گے؟"

کوئی ایسی چیز جو میرے دعویٰ کو ثابت کر سکے۔ آؤ نا گھبراتی کیوں ہو؟"

موہنی تھوڑی دیر پس و پیش کے بعد رندھیر کے ساتھ چل پڑی۔

جھیل کے دُوسرے کنارے پہنچ کر یہ دونوں گھنے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے اور رندھیر اس جگہ پہنچ کر رکا۔ جہاں مادھو پتھر تراشا کرتا تھا۔

رندھیر نے زمین پر بکھرے ہوئے سنگ ریزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "موہنی! کیا یہ اسی پتھر کے ٹکڑے نہیں جسے تراش کر وہ مورتی بنائی گئی ہے؟"

موہنی نے ایک ٹکڑا اٹھا کر غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "پتھر کا رنگ تو وہی ہے۔"

رندھیر نے کہا "مادھو کو میں نے یہ مورتی تراشتے ہوئے اس وقت دیکھا تھا جب یہ بالکل نکمی تھی۔ میں نے تم سے ذکر بھی کیا تھا لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ وہ ایسی مورتی تراش سکے گا۔"

لیکن اس مورتی کو مندر میں کس نے پہنچایا؟"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی پہلے اس نے پھول دے کر بھگوان کی پجارن

کو بھرشٹ کیا تھا اور اب اسی نے بھگوان کے مندر پر دھاوا بول دیا ہے۔ اگر شہر والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ مورتی جس پر وہ دھن دولت نچھاور کر رہے ہیں ایک اچھوت کی بنائی ہوئی ہے تو؟"

موہنی نے کہا "رندھیر! اگر مورتی اس نے مندر میں رکھی ہے تو بہت بُرا کیا ہے۔۔۔!"

رندھیر بولا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ مُورتی اس نے بنائی ہے۔ تاہم میرا یہ خیال ہے کہ اسے مندر میں لے آنے والا کوئی اور ہے۔ ممکن ہے کہ یہ گوپال یا شنکر کا کام ہو۔"

موہنی نے کہا "تو پھر انہیں اس بات کا علم ضرور ہوگا کہ وہ مادھو کی بنائی ہوئی ہے۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں موہنی! اس کی جان خطرے میں ہے۔"

"تم اس سے پوچھ نہیں سکتے؟"

"میں اُن سے پوچھنے سے پہلے مادھو سے پوچھنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"وہ کہاں ہوگا؟"

"یہیں پاس ہی اس کا گھر ہے۔ چلو وہاں چلیں۔"

"نہیں! مجھے نہ لے جاؤ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟"

"تم دُور ٹھہرنا۔ میں اُس سے پوچھ آؤں گا۔ ممکن ہے کہ وہ راستے میں کہیں بھیڑ بکریاں چراتا نظر آ جائے۔" گنجان درختوں سے باہر نکل کر انہیں ایک طرف سے بانسری کی آواز سنائی دی اور موہنی کا دل دھڑکنے لگا۔

رندھیر نے کہا "یہ وہی ہے چلو!"

موہنی اور رندھیر ایک ٹیلے پر سے گزرتے ہوئے ایک کھلے میدان میں پہنچے

مادھو سوکھی گھاس کے ایک ڈھیر پر بیٹھا بنسری بجا رہا تھا۔ آس پاس بکریاں اور بھیڑیں چر رہی تھیں۔ موہنی نے رک کر کہا: "رندھیر! تم پوچھ آؤ۔ میں یہیں ٹھہرتی ہوں۔"

"تم ڈرتی ہو اس سے۔" "آؤ!"

مادھو کے قریب پہنچ کر دونوں کچھ دیر کھڑے رہے۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا بالآخر رندھیر نے آہستہ سے آواز دی۔ "مادھو!"

مادھو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا "تم آگئے!" اس نے یکے بعد دیگرے دونوں کی طرف دیکھا اور بالآخر اس کی نگاہیں موہنی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

موہنی ان نگاہوں کی تاب نہ لاسکی اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

رندھیر نے کہا: "مادھو! میں تم سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔"

مادھو نے چونک کر رندھیر کی طرف دیکھا اور جلدی سے گھاس کا ڈھیر زمین پر بچھاتے ہوئے کہا: "آؤ، بیٹھ جاؤ!"

رندھیر نے کہا نہیں ہمیں جلدی ہے۔ میں تم سے صرف ایک سوال کا جواب پوچھنا چاہتا ہوں۔

"وہ مورتی جو تم بنا رہے تھے، کہاں ہے؟"

مادھو نے بدحواس ہو کر پہلے رندھیر اور پھر موہنی کی طرف دیکھا اور دونوں کے چہروں پر غصے کی بجائے ہمدردی کے آثار پا کر کہا "بیٹھ جاؤ میں بتاتا ہوں۔"

رندھیر اور موہنی ادھر ادھر دیکھ کر گھاس پر بیٹھ گئے اور مادھو نے ان سے ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "تم مندر سے ہو کر آئے ہو؟"

"ہاں!" رندھیر نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟"

رندھیر نے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مورتی تم نے وہاں پہنچائی

ہے یا۔۔۔!

"ہاں میں نے۔"

"کیوں؟"

"مورتیوں سے صرف مندروں والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ میرے کسی کام کی نہ تھی۔"

"لیکن تم تو بھگوان کا اوتار بننا چاہتے تھے؟"

"میں اب بھی بھگوان کا اوتار بننا چاہتا ہوں لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے مورتی میری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ بھگوان کی راہ دکھانے کے لیے دنیا میں بہت کچھ ہے۔ چاند، سورج، ستاروں، دریاؤں اور پہاڑوں کے ہوتے ہوئے ہمیں بھگوان کی محبت کے لیے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مورتیوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

رندھیر نے لاجواب سا ہو کر کہا: اگر لوگوں کو یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں تو تم جانتے ہو کہ تمہاری سزا کیا ہوگی؟

"اگر تم سزا دینا چاہو تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی۔"

شانتا مادھو کا کھانا لے کر آرہی تھی۔ اس کی آمد سے گفتگو کا یہ سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو گیا۔ شانتا نے لسی کا کٹورا زمین پر رکھ کر اس کے اوپر ایک میلے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں رکھ دیں اور حیرانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رندھیر اور موہنی کی طرف دیکھنے لگی۔ بالغ ہستی کا یہ حسین غنچہ اب مہکتا ہوا پھول بن چکا تھا۔

رندھیر گزشتہ چند مہینوں میں شانتا کو دوبارہ دیکھنے کی کئی تدبیریں سوچ چکا

تھا آج بھی اس کے تحت الشعور میں اگر حُسن اور معصومیت کے اس پیکرِ مجسّم کی جستجو کارفرما نہ ہوتی تو وہ موہنی کو مادھو کی تلاش کے لیے اس قدر مجبور نہ کرتا۔ اس کے خوابوں کی دیوی اس کے سامنے تھی وہ کوشش کے باوجود شانتا سے بے تعلقی ظاہر نہ کر سکا۔ اس نے کہا: "موہنی! تم اسے جانتی ہو؟"

"یہ شانتا ہے، مادھو کی بہن۔ بیٹھ جاؤ شانتا!"

شانتا نے مادھو کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

موہنی کی نسوانی حِس کو رندھیر اور شانتا کی نگاہوں کے سوال و جواب سمجھنے میں دیر نہ لگی اس نے کہا: "جب ہم نے شانتا کو دیکھا تھا یہ بہت چھوٹی تھی۔"

"ہاں۔ لیکن میں نے اسے اس دن بھی دیکھا تھا۔"

"کب؟"

"جب مادھو کی تلاش کے لیے آیا تھا۔"

رندھیر اور موہنی بچپن کے ساتھی تھے اور انہیں عمر بھر کے ساتھی بنانے کے متعلق دونوں کے والدین کی طرف سے مبہم سے اشارے بھی ہو چکے تھے یہی وجہ تھی کہ مادھو کے جذبات سے باخبر ہونے کے باوجود موہنی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کا فیصلہ نہ کر سکی۔ اب تک مادھو کے ساتھ اس کا اُنس فقط ہمدردی تک محدود تھا۔ وہ رندھیر کے ہوتے ہوئے اپنے دل میں کسی کا خیال تک لانا ایک پاپ سمجھتی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اگر رندھیر نہ ہوتا تو وہ مادھو کو اس قدر قریب سے دیکھنے پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ اگر وہ بھی رندھیر کی طرح ایک کھشتری ہوتا تو وہ شاید تمام عمر یہ فیصلہ نہ کر سکتی کہ اپنی دائمی محبت کے لیے کسی کو منتخب کرے اور اگر یہ دونوں اس کے بچپن کے ساتھی ہوتے

تو جوانی تک پہنچتے پہنچتے اس کے دل پر صرف مادھو کا قبضہ رہ جاتا۔ اب وہ رندھیر سے محبت کرتی تھی لیکن مادھو سے ڈرتی تھی۔ کیونکہ وہ حسین ہونے کے باوجود ایک اچھوت تھا۔

رندھیر کو انتہائی محویت کے ساتھ شانتا کی طرف متوجہ پا کر اس نے مادھو کی طرف دیکھا وہ بے قرار اور تیز نگاہیں اس کی آنکھوں سے گزرتی ہوئی دل کی گہرائیوں تک جا پہنچیں اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں اس اچھوت کے لیے صرف ہمدردی کے جذبات ہی نہیں، بلکہ وہ اس کے دل کے ساز کے ان سوئے ہوئے تاروں کو چھیڑ سکتا ہے جن تک رندھیر یا کسی اور کی نگاہوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ وہ سوچنے لگی۔ کاش! مادھو رندھیر ہوتا لیکن اسے فوراً اس خیال پر شرم سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر بولی۔

"چلو رندھیر دیر ہو رہی ہے۔ ماتا جی میرا انتظار کرتی ہوں گی۔"

رندھیر بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مادھو اور شانتا بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رندھیر نے کہا: "مادھو! موہنی کو تمہاری بہت فکر تھی۔"

موہنی کو رندھیر کی یہ طنز بری معلوم ہوئی۔ وہ اس کے جواب میں شانتا کو رندھیر کے متعلق کچھ بتانا چاہتی تھی۔ تاہم وہ خاموش رہی۔

رندھیر نے پھر کہا "اچھا مادھو چلتے ہیں ہم نے تمہیں بہت پریشان کیا۔"

"کاش! تم مجھے ہر روز پریشان کرتے رہو" یہ کہہ کر مادھو موہنی کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھیا! میں بھی گھر جاتی ہوں" شانتا نے کہا۔

"اچھا جاؤ۔"

شانتا، موہنی اور رندھیر کے پیچھے پیچھے چل دی۔ رندھیر نے مڑ کر پوچھا "شانتا! تمہارا بھائی اب بھی پتھر تراشا کرتا ہے یا نہیں؟"

"اسے چچا بدھو نے منع کر دیا ہے۔ وہ مورتی جو اس نے بنائی تھی وہ بھی کہیں پھینک آیا ہے۔"

موہنی نے پوچھا "تمہاری ماں کیسی ہے؟"

"اچھی ہے تم اس سے ملو گی؟ چلو وہ بہت خوش ہو گی۔"

رندھیر نے کہا "ہاں موہنی دیکھو گی اس کی ماں کو؟"

"نہیں! اب ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ پھر سہی۔"

تھوڑی دور چل کر ان کے راستے علیحدہ ہو گئے۔

---

(۴)

موہنی اور رندھیر کو رخصت کرنے کے بعد مادھو کچھ دیر بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا لیکن وہ جونہی ٹیلے کی آڑ میں غائب ہوئے اس کے دل میں اک طوفان سا اٹھا اور وہ کچھ سوچے بغیر ان کے پیچھے بھاگا اور آن کی آن میں ٹیلے کی چوٹی پر جا پہنچا۔ رندھیر اور موہنی اتنی دیر میں ٹیلے سے نیچے اتر کر جھیل کے کنارے درختوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ مادھو کی بے قرار نگاہیں کچھ دیر ان کا تعاقب کرتی رہیں لیکن تھوڑی دیر میں وہ گھنے درختوں میں چھپ گئے اور مادھو کو فضا میں ہر طرف اداسی نظر آنے لگی۔ اس نے سوچا۔ شاید میں موہنی کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔ وہ آنے والی زندگی میں مایوسی، تنہائی اور بے بسی کے تصور سے کانپ اٹھا۔ مندر اور مورتیاں چھوت اور اچھوت کی حد فاصل کے درمیان اب تک ایک پل کا کام دے رہے

تھے لیکن اب یہ پل منہدم ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں موہنی نے بھگوان کی مورتی کے لیے جگہ خالی کی تھی لیکن بدھو کی بے وقت مداخلت نے ایک اچھوت کے دل کو زیادہ عرصہ بھگوان کی مورتی کا مندر نہ بننے دیا۔

تاہم مورتی سے رشتہ توڑنے کے بعد مادھو کو احساس ہوا کہ اس کے دل کی بستی ایک ایسے وجود کے تصور سے آباد ہو چکی ہے جو دنیا کے حسین مناظر کی طرح ایک زندہ حقیقت ہے ...... یہ زندہ حقیقت موہنی تھی۔ ... موہنی جس نے اس کے شعور میں داخل ہو کر اس کے دل میں مندر، مورتیاں اور دیوتاؤں سے لگاؤ پیدا کیا تھا ... موہنی جو اس کا منتہائے مقصود تھی ... جس تک پہنچنے کے لیے وہ بھگوان کی مورتی کی رہنمائی اور مدد چاہتا تھا۔ بھگوان یا کائنات کی ایک عظیم طاقت کا اسے اب بھی اعتراف تھا لیکن اس کی پرواز کا رخ بھگوان کی طرف نہ تھا بلکہ وہ اس زبردست طاقت سے قوت پرواز حاصل کر کے اس خلیج کو عبور کرنا چاہتا تھا جو موہنی اور اس کے درمیان حائل تھی۔

ٹیلے پر کھڑا کچھ دیر وہ آگے بڑھنے یا پیچھے لوٹنے کا فیصلہ نہ کر سکا لیکن اچانک ایک خیال سے اس کے جسم میں بجلی کی لہریں دوڑنے لگیں "کیا موہنی کو یہاں لانے میں اس زبردست قوت کا ہاتھ نہیں۔ کیا اس کا یہاں آنا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ اسے میرے ساتھ اُنس ہے؟ لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود اپنے دل کی بات نہ بتا سکا۔ اسے خوش کرنے کی بجائے میں نے اونچی ذات والوں کو برا بھلا کہہ کر شاید اسے ناراض کر دیا ہو۔ کیا یہ ضروری نہ تھا کہ میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتا؟"

یہ خیال آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ زبردست قوت ایک تازہ اقدام کے لیے اُس کی تائید کر رہی ہے۔ وہ جھاڑیوں سے بچتا اور پتھروں پر کودتا ہوا

ٹیلے سے نیچے اُترا اور پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔

درختوں سے نکل کر رندھیر اور موہنی کو دیکھتے ہی اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا "اگر رندھیر بُرا مان گیا تو؟" اور پھر خود ہی یہ کہہ کر دل کو تسلی دینے لگا "نہیں رندھیر! ایسا نہیں۔ وہ اونچی ذات کے دوسرے انسانوں سے مختلف ہے اسے میرے ساتھ ہمدردی ہے۔ اور اگر وہ خفا بھی ہو جائے تو بھی مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ محبت پاپ نہیں۔ موہنی یقیناً میری باتوں سے خفا نہ ہوگی۔ اور اگر خفا ہو بھی گئی تو کم از کم میرے دل سے تمام عمر کی خلش دور ہو جائے گی۔ اس کی رفتار پھر تیز ہونے لگی۔

رندھیر اور موہنی اس کے پاؤں کی آہٹ سے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ اُن کی جواب طلب نگاہیں پھر اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئیں اور وہ رک کر ایک لمحہ کے توقف کے بعد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

رندھیر نے پوچھا: "کیوں مادھو! خیر تو ہے؟" رندھیر کے لہجے میں ہمدردی بھی تھی اور حیرانی بھی۔ تاہم مادھو کچھ دیر اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ بالآخر اس نے بڑی کوشش کے بعد کہا: "میں . . . . میں۔ موہنی دیوی سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

موہنی پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ رندھیر نے کہا: "کہو! کیا کہنا چاہتے ہو موہنی سے؟"

مادھو کے دماغ میں اب کوئی موضوع تھا نہ الفاظ۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا: "موہنی دیوی! ابھی جو کچھ میں نے مورتی کے متعلق کہا تھا۔ آپ اُس سے خفا تو نہیں ہو گئیں؟"

موہنی اس سوال کا جواب دینے کی بجائے سراسیمگی کے عالم میں اُس کی

طرف دیکھنے لگی۔ مادھو پھر بولا "میرا یہ ارادہ نہ تھا کہ میں آپ کا دل دکھاؤں۔"

موہنی نے مادھو کو ٹالنے کی نیت سے کہا: "میں تم سے خفا نہیں۔ مجھے تم پر خفا یا خوش ہونے کا حق ہی نہیں۔"

مادھو کہنا چاہتا تھا کہ یہ حق میں آپ کو دے چکا ہوں لیکن اسے جرأت نہ ہوئی۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اسے موہنی کی بجائے رندھیر سے مخاطب ہونا نسبتاً آسان نظر آیا۔ وہ بولا:

"رندھیر! میں دیوتاؤں سے محبت نہ کر سکا۔ لیکن میرے دل میں تمہارا پریم اس پریم سے کہیں زیادہ ہے جو تمہارے دل میں دیوتاؤں کے لیے ہے۔ میں اس زبردست طاقت کو مانتا ہوں جسے تم بھگوان کہتے ہو لیکن میں اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کی بجائے بھگوان کے بنائے ہوئے دیوتاؤں سے پریم کرنا بہتر سمجھتا ہوں اور میرے لیے تم بھگوان کے بنائے ہوئے دیوتا ہو۔"

"اس تم کا اشارہ رندھیر سے زیادہ موہنی کی طرف تھا اور وہ اس کی مٹھاس محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ایک عورت تھی اور اس کے سامنے وہ ایک مرد تھا جس کی آنکھوں میں شب کی سیاہی اور ستاروں کا نور تھا۔ جس کی ہر نگاہ چھوت اور اچھوت کے درمیان صدیوں سے تعمیر ہونے والی ناقابلِ تسخیر دیواروں کو مسمار کر رہی تھی۔

اس نے اضطراری حالت میں کہا: "مادھو ہم تم سے ناراض نہیں۔" سماج کی مقدس بیٹی کا غرور ملائمت میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن ان الفاظ کے بعد جب اس نے رندھیر کی طرف دیکھا تو یہ ملائمت حیا میں تبدیل ہونے لگی۔ اس نے کہا "چلو رندھیر!"

مادھو نے پوچھا: "پھر آؤ گے؟"

رندھیر نے جواب دیا "شاید!"

اس شاید سے رندھیر کا مطلب ضرور تھا لیکن موہنی اپنے خیال کے مطابق ہمیشہ کے لیے جُدا ہو رہی تھی۔

---

(۵)

اس ملاقات کے بعد مادھو کی زندگی کی تمام دلچسپیاں سمٹ کر موہنی کے تصور میں سما گئیں۔ اسے دنیا کی ہر حسین شے اور ہر دلکش منظر میں موہنی کی جھلک نظر آنے لگی۔ موہنی جس نے اس کے تحت الشعور میں داخل ہو کر اسے بھگوان کی طرف مائل کیا تھا جس نے اپنے خالق کی مورتیاں بنانے پر آمادہ کیا تھا۔ اب اس کے دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

بھگوان کی مورتی کو مندر میں چھوڑ آنے کے بعد مادھو نے محسوس کیا کہ وہ زنجیر جس کی مدد سے وہ موہنی کے ساتھ منسلک ہونا چاہتا تھا، ٹوٹ چکی ہے۔ وہ پُل جو اچھوت کے ایک جھونپڑے کو چھوت کے محل سے ملانے کا کام دے سکتا تھا ایک غیر متوقع سیلاب کی نذر ہو چکا ہے۔

کئی مہینے مورتی تراشنے میں منہمک رہ کر وہ کئی ہوائی قلعے تعمیر کر چکا تھا مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر ہر التجا کے بعد اسے محسوس ہوتا کہ وہ آج نہیں تو کل کل نہیں تو پرسوں بھگوان کا اوتار بن جائے گا۔ بھگوان اپنی بے جان مورتی کو بولنے کی قوت عطا کرے گا۔ اور وہ کہے گی کہ "مادھو! ہم تم سے بہت خوش ہیں مانگو کیا مانگتے ہو؟" اور وہ جوشِ عبودیت میں مورتی کے پاؤں پر سر رکھ کر اس کے مقدس چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے دھونے کے بعد کہے گا کہ "بھگوان! میں تجھ سے

موہنی کو مانگتا ہوں۔" اور بھگوان یہ کہے گا کہ ہم تیری یہ خواہش پوری کرتے ہیں۔

پھر بھگوان اپنی نامعلوم قوتوں کے ساتھ اونچی ذات والے ہر شخص کے دل میں داخل ہو کر کہے گا۔ "دیکھو! مادھو ہمارا اوتار ہے تمہیں اس سے نفرت کرنے کا حق نہیں۔ اور اس کے زبردست ہاتھ موہنی کو سماج کی زنجیروں سے چھڑا کر اس کے پاس لے آئیں گے اور پھر وہ اور موہنی مل کر ایسی دنیا تعمیر کریں گے جس میں ہر انسان۔ انسان سمجھا جائے گا جس میں چھوت اور اچھوت کے درمیان نفرت اور حقارت کی دیواریں نہیں ہوں گی۔"

لیکن بدھو نے یہ تمام ہوائی قلعے مسمار کر دیے۔ حسین سپنوں کی سہانی رات دن کی تلخ حقیقتوں میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ بار بار اپنے دل میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ کاش! میں تمام عمر ان سپنوں کے فریب میں مبتلا رہتا۔

صبح کے وقت اس نے بدھو کے ساتھ بھیڑیں لے جاتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ کر شہر کی طرف دیکھا وہ پگ ڈنڈیاں جو باہر کی دنیا کو شہر سے ملاتی تھیں ناقابلِ گزر اور حوصلہ شکن نظر آنے لگیں اس نے مندر کی طرف نگاہ دوڑائی اور محسوس کیا کہ وہ مورتی جسے وہ خود تراش کر مندر میں رکھ آیا تھا۔ موہنی اور اس کی قوم کے تمام انسانوں کو مادھو اور اس کی قوم کے تمام انسانوں کے ساتھ نفرت اور عداوت کا سبق دے رہی ہے۔ اور یہ کہ وہ بھگوان کا اوتار بننے کے لیے نہیں بلکہ اچھوت رہنے اور اچھوت کہلانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

لیکن دوپہر کے وقت رندھیر کے ساتھ موہنی کی غیر متوقع آمد کے بعد اس پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ سماج کے مندروں اور مورتیوں کا باغی ہونے کے باوجود موہنی کی نظروں میں قابلِ نفرت نہیں اس انکشاف کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتیں پھر

حسین سپنوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہوائی قلعے پھر تعمیر ہونے لگے۔ اس کے من مندر میں بھگوان کی مورتی کی خالی جگہ موہنی کی جیتی جاگتی تصویر نے لے لی۔ مورتی کے وسیلہ سے بھگوان تک پہنچنے کی بجائے اسے موہنی کا وسیلہ بنا کر بھگوان تک پہنچنا زیادہ آسان اور خوش کن نظر آنے لگا۔

مادھو کو اپنی دنیا کے ہر افق پر موہنی اور صرف موہنی نظر آنے لگی۔ وہ بنسری کے ہر نغمے میں اس کی آواز کی مٹھاس پیدا کرنا چاہتا تھا اور روئے زمین کے ہر پتھر کو تراش کر موہنی کی شکل میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سماج والوں کے ہر مندر سے بھگوان کی خیالی تصویریں اٹھا کر ان کی جگہ موہنی کی تصویریں رکھ دے۔ مندر کی مورتیاں بھگوان کے متعلق سنگ تراشوں کے پست تصورات کی آئینہ دار تھیں لیکن موہنی بھگوان کی اپنی قوتِ تخلیق کا مظہر تھی اس کی صناعی کا بہترین نمونہ۔

موہنی کے لیے بڑھتے ہوئے شوق کے ساتھ ہی گردوپیش کی دلچسپیاں کم کم ہونے لگیں۔ چند دنوں کے بعد اس نے محسوس کیا کہ بھیڑیں چرانے اور مچھلیاں پکڑنے کا مشغلہ ایسا نہیں جو اس کے دل کی بڑھتی ہوئی بے قراری کا مداوا ہو سکے۔ اسے انتظار کے لیے لمبے دن اور تنہائی کی طویل راتیں صبر آزما نظر آنے لگیں۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے کسی ہمراز، کسی رفیق اور کسی دوست کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن آس پاس کی بستیوں کے اچھوتوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی اس ضرورت کو پورا کر سکتا۔ احساسِ کمتری میں پسے ہوئے انسانوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی بڑھتی ہوئی امنگوں اور اٹھتے ہوئے حوصلوں کی تائید کرتا ——

قریباً دو ہفتے انتہائی پریشانی کی حالت میں گزارنے کے بعد وہ جھیل کے کنارے ایک جگہ زمین میں دفن کیے ہوئے اوزار نکال کر گھر لے آیا۔ دوپہر

کے وقت اس نے دریا کے کنارے پڑے ہوئے پتھروں میں سے ایک سفید رنگ کا بھاری پتھر منتخب کیا اور اسے بھی اٹھا کر گھر لے آیا۔

لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر ایسا مشغلہ جاری رکھنے کے لیے جھیل کے آس پاس کئی محفوظ مقامات تھے لیکن مادھو اس معاملہ میں کسی کی مداخلت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ سماج والوں کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ ان کی نگاہوں سے اور جگہوں کی نسبت اس کی جھونپڑی زیادہ محفوظ ہے۔ اپنے گھر میں اسے سب سے زیادہ بدھو کی مخالفت کا ڈر تھا لیکن اسے یہ تسلی تھی کہ بدھو کو فقط دیوتاؤں کی مورتیوں سے نفرت ہے۔ جب اسے یہ علم ہوگا کہ وہ بھگوان یا دیوتا کی بجائے کسی انسان کی مورتی بنا رہا ہے تو شاید وہ معترض نہ ہو۔

چنانچہ جب بدھو شام کے وقت مچھلی کے شکار سے واپس آیا تو مادھو سنگ تراشی میں مصروف تھا۔ اس نے آتے ہی کنول اور شانتا سے جو باہر کھڑی تھیں، پوچھا "مادھو کہاں ہے؟"

کنول نے سادگی سے جواب دیا "اندر پتھر توڑ رہا ہے۔ کہتا ہے شانتا کے لیے پتھر کی گڑیا بناؤں گا۔ اور اسے دیکھو یہ اتنی بڑی ہو کر گڑیا سے کھیلے گی؟"

شانتا اپنی ماں کے اس جواب پر بدھو کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر گھبرا گئی اور جلدی سے بولی: "ہاں چچا! بھیا بہت اچھی گڑیا بناتا ہے۔"

جھونپڑی کے اندر تیشے کی ٹھک ٹھک اچانک بند ہو گئی اور مادھو جھجکتا ہوا باہر نکلا اور بدھو کی طرف سے کسی سوال کا انتظار کیے بغیر بولا "چچا میں شانتا کے لیے گڑیا تراش رہا ہوں۔"

بدھو کچھ کہے بغیر جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور پتھر کی ضخامت سے

قدرے پریشان ہو کر مادھو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں طرح طرح کے شکوک کا اظہار کر رہی تھیں۔

مادھو پھر بولا "چچا! شانتا کہتی تھی کہ مجھے گڑیا بنا دو اور میں بھی بہت اداس تھا چند دن جی لگا رہے گا۔"

"شانتا اب جوان ہے اسے گڑیا سے کیا کام؟ مادھو مجھے ڈر ہے کہ تمہارے خیالات ابھی تک درست نہیں ہوئے۔"

"چچا تمہارا خیال ہے کہ میں پھر بھگوان کی مورتی بنا رہا ہوں؟ نہیں نہیں میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں ایک ایسی گڑیا بناؤں گا جسے آپ بھی پسند کریں گے۔"

مادھو کا جواب بدھو کو مطمئن نہ کر سکا۔ تاہم وہ خوش تھا کہ مادھو نے یہ بات اس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

چند دنوں کے بعد سنگ تراشی میں مادھو کا بڑھتا ہوا انہماک دیکھ کر بدھو اور کنول پریشان ہونے لگے۔ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جھونپڑی سے ٹھکا ٹھک کی آواز آتی رہتی اور جب تیشہ چلاتے چلاتے مادھو کے ہاتھ تھک جاتے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے بنسری اٹھا لیتا اور جھونپڑی میں کبھی پر سرور اور کبھی دردناک نغمے گونجنے لگتے۔ شانتا بھی اپنی گڑیا کے لیے مادھو کی اس درجہ محنت پر حیران تھی۔

کبھی کبھی بدھو اسے بھیڑیں چرانے یا شکار کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا لیکن مادھو سے کام کی تکمیل کا شوق اسے زیادہ دیر باہر نہ ٹھہرنے دیتا۔ چند دنوں کے بعد شانتا اپنے گھر میں ایک خوبصورت گڑیا دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی لیکن مادھو اپنی کاوش پر مطمئن نہ تھا۔ شانتا نے اس کے کان میں کہا "بھیا! یہ تو موہنی معلوم ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں! یہ موہنی جیسی نہیں میں اور بناؤں گا اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔"

اگلے دن، مادھو بدھو کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے باوجود ایک نیا مجسمہ تراش رہا تھا۔

رندھیر اور شانتا

رندھیر نے موہنی کے متعلق اپنے خیالات کا کبھی تجزیہ نہیں کیا تھا۔ وہ بچپن سے ایک ساتھ رہے۔ ایک ہی پنڈت سے تعلیم پائی۔ ایک دوسرے کے متعلق انہیں تنہائی میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا اور جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھنے کے بعد بھی ان دونوں کو مستقبل میں جدائی کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس لیے وہ جذبات جو جدائی کے خدشات میں ابھرتے ہیں۔ ایک دائمی قربت کی وجہ سے دبے رہے۔ موہنی والدین کے بعد رندھیر کو اپنا نگران اور محافظ خیال کرتی تھی اور وہ اسے اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی دلچسپی سمجھتا تھا۔

شانتا اور مادھو سے آخری ملاقات کے بعد دونوں کو اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع ملا۔ رندھیر ایک ناپختہ ذہن نوجوان کی طرح زندگی کے چند دن حالات کے سیلاب کے ساتھ بہنا چاہتا تھا لیکن موہنی ایک عورت کی فطرت سے مجبور ہو کر آنے والے طوفان سے بچنے کے لیے کسی جائے پناہ کی تلاش میں تھی۔

رندھیر جب بھی صبح کے وقت شکار اور شام کے وقت سیر کے بہانے سے نکلتا اس کی پہلی اور بعض اوقات آخری منزل جھیل کے آس پاس کی چراگاہیں ہوتیں۔ کبھی مادھو سے ملنے کے بہانے شانتا سے ملاقات ہو جاتی اور کبھی اسے مایوس لوٹنا پڑتا۔

شانتا کے ساتھ ابتدائی دو تین ملاقاتیں مادھو کی موجودگی میں ہوئیں۔ اس

بیے اس سے کچھ کہنے اور سننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ایک دن چراگاہ میں مادھو کے ساتھ بدھو سے بھی ملاقات ہوئی۔ بدھو اونچی ذات والوں کے متعلق اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن رندھیر کے ساتھ وہ بہت جلد مانوس ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رندھیر اس کے ساتھ نہایت انکسار سے پیش آیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رندھیر کا لباس قریباً وہی تھا جس میں اُس نے پہلی بار سکھدیو کو دیکھا تھا۔ سکھدیو کی طرح اس کی کمر میں بھی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کی انگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی سکھدیو کی انگوٹھی کنول کے پاس تھی اور تلوار اب تک بدھو نے سنبھال کر رکھ چھوڑی تھی۔

بدھو نے پوچھا "تم راجہ کے سیناپتی ہو؟"

رندھیر بدھو کے منہ سے سیناپتی کا لفظ سن کر حیران ہوا۔ اس نے جواب دیا "نہیں! میں سیناپتی نہیں۔ میرا باپ سیناپتی تھا لیکن اب وہ شہر کا سردار ہے"

بدھو نے کہا "تمہارے پتا جی تو ہم لوگوں سے ضرور نفرت کرتے ہوں گے؟"

"نہیں وہ ہر ایک سے انصاف کرتے ہیں"

"میں نے سنا ہے تمہارا ایک سیناپتی اچھوتوں کا بہت بڑا دشمن تھا شاید گنگارام تھا نام اس کا؟"

"گنگارام کو مرے ہوئے بہت مدت ہوئی ہیں اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا"

"گنگارام کو کسی اچھوت نے مارا تھا؟"

"نہیں اسے ایک کشتری نے مارا تھا وہ میرے پتا کا دوست تھا"

"کیا نام تھا اس کا؟"

"سکھدیو"

سکھدیو کا نام سن کر مادھو چونکا ہوا لیکن وہ یہ سمجھ کر خاموش ہو رہا کہ یہ ایسی

نام کا کوئی دوسرا شخص ہوگا۔

بدھو نے مادھو کی موجودگی میں یہ سلسلۂ کلام جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اس نے کہا "مادھو! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ جاؤ گھر سے لسی لے آؤ۔"

مادھو گھر کی طرف چل دیا اور بدھو نے رندھیر سے پوچھا "تمہارے باپ کا نام رام داس تو نہیں؟"

"ہاں! ان کا نام یہی ہے، لیکن تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں نے کسی سے سنا ہے۔"

بدھو، سکھدیو سے اس کی سرگزشت کئی بار سن چکا تھا۔ اب یہ معلوم کر کے کہ رندھیر رام داس کا بیٹا ہے اس کے تمام شکوک جاتے رہے ورنہ اونچی ذات کے کسی شخص کے ساتھ مادھو کا میل جول اس کے لیے یقیناً تکلیف دہ ہوتا۔ اس کے جی میں آئی کہ اسے سکھدیو کے متعلق کچھ بتائے، لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔

رندھیر کی آنکھیں جھونپڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن اس کی توقع کے خلاف جب مادھو لسی لے کر اکیلا واپس مڑا تو وہ دل پر ایک بوجھ سا لے کر رخصت ہوا راستے میں جھیل کے قریب پہنچ کر اس کا دل مسرت سے اچھلنے لگا۔ شانتا پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے آرہی تھی وہ رندھیر کو دیکھ کر ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی۔

"شانتا!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

شانتا نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور اس کے مرمریں چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی۔

"شانتا! میں تمہارے بھائی کے پاس بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

شانتا نے جھجکتے ہوئے گھڑا نیچے رکھ دیا اور پوچھا "موہنی دیوی کیسی ہے؟"

"اچھی ہے، تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔"

"وہ آپ کی کیا ہوتی ہے؟"

"وہ میرے پتا کے دوست کی بیٹی ہے۔"

دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ رندھیر اس سکوت کو توڑنے کے لیے کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے کسی چوپائے کے بھاگنے کی آہٹ اور کسی انسان کی گالیاں سنائی دیں۔ درختوں میں سے ایک بدحواس گائے نمودار ہوئی اس کے پیچھے شنکر گالیاں بکتا ایک ہاتھ سے گائے کی دُم پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے ڈنڈے برساتا چلا آ رہا تھا لیکن گائے تھی کہ مُڑنے کا نام نہ لیتی تھی اور ہانپتے ہوئے شنکر کا پارہ اس لیے بھی تیز ہو رہا تھا کہ یہ گائے گوپال کی تھی۔ رندھیر نے جلدی سے کہا: "اچھا شانتا! تم جاؤ پھر ملیں گے۔"

شانتا گھڑا اٹھانے لگی اور رندھیر ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ شنکر نے ان دونوں کو دیکھ کر گائے کی دُم چھوڑ دی اور رندھیر کے قریب آ کر کہا۔ "بڑی خراب ہے جی یہ گائے!"

رندھیر نے جواب دیا "گائے خراب نہیں، چرواہا بے وقوف ہے!"

شنکر رندھیر کی طنز کو پی گیا اور بولا: "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

رندھیر نے جواب دیا "میں شکار کے لیے آیا تھا۔ اب تمہارا منہ دیکھ لیا ہے اس لیے گھر جاتا ہوں۔"

شنکر نے کہا "شکار تو جا رہا ہے۔"

"کون سا شکار؟"

شانتا کچھ دور جا چکی تھی۔ شنکر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ!—"

رندھیر نے کڑک کر کہا: "دیکھو شنکر! ہوش سے بات کرو۔ تم ایک برہمن ہو۔"

شنکر نے کھسیانا ہو کر کہا: "معاف کرنا میں مذاق کر رہا تھا۔"

"مذاق کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور وہ بھگوان نے بدقسمتی سے تمہیں نہیں دی۔"

شنکر بڑبڑاتا ہوا گائے کے پیچھے اور رندھیر اسے دل ہی دل میں کوستا ہوا شہر کی طرف چل دیا۔

(۲)

اساڑھ کے آخری دن تھے۔ مغرب کی طرف نصف آسمان پر سیاہ، سفید اور مٹیالے رنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ ہوا ساکن تھی اور فضا میں حبس تھا۔ دوپہر کے وقت سورج بادلوں کے لحاف میں چھپ گیا اور ابر کا سایہ تیز رفتاری سے مشرق کے ٹیلوں اور پہاڑوں پر دوڑنے لگا۔

شانتا اور کنول اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک شانتا کو جھونپڑی کے پیچھے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا اور وہ اٹھ کر جھونپڑی کی دوسری طرف پہنچی۔ چند قدم پر رندھیر گھوڑے کی لگام تھامے متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شانتا کی نگاہوں نے اسے سمجھا دیا کہ یہاں باتیں کرنا مناسب نہیں اور رندھیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتا دیا کہ وہ جھیل کی طرف جا رہا ہے۔ رندھیر کا گھوڑا گھنے درختوں میں غائب ہو گیا اور شانتا اپنی ماں کے پاس آ بیٹھی۔

کنول نے پوچھا "کون تھا شانتا؟"

اس نے جواب دیا "خبر نہیں کون تھا۔" اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی:

"ماتا! آج بہت گرمی ہے میں ذرا جھیل پر نہا آؤں۔"

"ابھی تو وہاں سے آئی ہو، اچھا جاؤ۔"

شانتا اپنی ماں کی حدِ نظر تک تو معمولی رفتار سے چلتی رہی لیکن جھاڑیوں کے عقب میں پہنچتے ہی وہ ایک وحشی ہرنی کی طرح بھاگنے لگی۔

رندھیر کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا اور وہ پانی میں غوطہ لگانے کے بعد کپڑے بدل رہا تھا۔ رندھیر کو دیکھتے ہی شانتا کی رفتار سست پڑ گئی اور وہ اس کے قریب جانے کی بجائے کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ رندھیر نے اس کے قریب پہنچ کر کہا "شانتا! تم آ گئیں؟"

شانتا نے رندھیر کو جواب دینے کی بجائے ایک ہاتھ سے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ پکڑ کر نیچے کھینچی اور دوسرے ہاتھ سے ایک پتّا توڑ کر نیچے پھینک دیا۔

رندھیر نے پھر سوال کیا "شانتا! مادھو کہاں ہے؟"

شانتا نے دوسرا پتّا توڑتے ہوئے جواب دیا "وہ سارا دن گھر پر رہتا ہے آج چچا بدھو اسے زبردستی بھیڑیں چرانے لے گیا ہے۔"

"سارا دن گھر پر کیا کرتا ہے وہ؟"

"مورتیاں بنایا کرتا ہے۔"

"مورتیاں؟ وہ کیسی؟"

اس نے تین مورتیاں بنائی ہیں بالکل موہنی جیسی۔ لیکن تیسری سب سے خوب صورت ہے۔"

رندھیر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ موہنی کی مورتی بنانا ایک اچھوت کا ایسا جرم نہ تھا جسے وہ آسانی سے معاف کر سکتا۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی تمام گزشتہ حرکا

پر شرم و ندامت محسوس ہونے لگی۔ مادھو اسے قابلِ نفرت نظر آنے لگا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ موہنی اور مادھو کے درمیان اگر میں ایک زنجیر کا کام نہ دیتا تو مادھو کو یہ جسارت نہ ہوتی۔ اور اب یہ معاملہ ایک خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے۔ موہنی کو بدنامی سے بچانا میرا فرض ہے۔ میں مادھو کو سمجھا سکتا ہوں اور اگر موہنی کو اس کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے تو وہ ہمدردی تک محدود ہے اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ایک اچھوت اس کی مورتیاں بنا رہا ہے تو وہ اسے عمر بھر معاف نہیں کرے گی ــــ لیکن میں بھی تو مادھو سے مختلف نہیں۔ میں نے بھی تو آج تک یہ نہیں سوچا کہ میرے اور ایک اچھوت لڑکی کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہے جسے پاٹا نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود میں مستقبل کے نتائج سے بے پروا اس کے پیچھے بھاگا پھرتا ہوں۔ کیا مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ سماج کی بیڑیاں توڑ سکوں؟ اس لڑکی کے لیے چنڈال کہلانا گوارا کر لوں گا؟ ان سوالات کے جواب میں اس کا ضمیر پکار اُٹھا۔ "نہیں رندھیر! نہیں!! تم مادھو کی طرح خود فریبی میں مبتلا ہو۔ تم شانتا کو ایک کھیل، ایک عارضی دلچسپی سمجھتے ہو۔ تم صرف اس مہکتے ہوئے پھول سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو لیکن تمہارے دل پر اس کی محبت سے کہیں زیادہ سماج کا احترام اور اگر احترام نہیں تو خوف سوار ہے۔ تم جن پاؤں چل کر اس طرف آئے ہو انہیں پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور پھر اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ کیا تمہارا پریم اس کے لیے ایک زہر کا پیالہ نہ ہوگا؟"

رندھیر نے مغموم نگاہوں سے شانتا کی طرف دیکھا۔ وہ فکر مند سی ہو کر بولی۔ "آپ مورتی کے متعلق سوچ رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "ہاں مورتی کے متعلق۔ میں سوچ رہا تھا کہ . . . . شانتا فرض کرو کہ میں یہاں دوبارہ نہ آ سکوں تو . . . . تم کیا محسوس کرو گی؟"

شانتا کی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئیں۔ وہ چہرہ جو ایک لمحہ پیشتر کائنات کی مسرتوں کا گہوارہ تھا حزن وملال کی تصویر بن گیا۔ دھڑکتے ہوئے دل کی اُمنگیں، حوصلے اور ولولے، التجائیں بن کر رہ گئیں۔ اور یہ التجائیں کانپتی ہوئی آواز بن کر زبان تک پہنچیں۔ ہونٹ تھرتھرائے، کانپے اور ایک دوسرے سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ شانتا کچھ کہہ نہ سکی۔ اور التجائیں آنکھوں میں آنسو بن کر چھلکنے لگیں۔

شانتا نے سر جھکا لیا۔ اور میلے دوپٹے کے ساتھ آنسو پونچھ کر نیچے دیکھنے لگی۔

اچانک اسے گھاس میں کوئی متحرک شے نظر آئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو گیا۔ آنکھوں سے حزن وملال کی بجائے خوف وہراس ٹپکنے لگا۔ ایک افعی، گھاس سے اوپر سر نکالے رندھیر کی ٹانگ کے بالکل قریب آچکا تھا۔ شور مچانے کا موقع نہ تھا۔ شانتا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور رندھیر کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔ جس وقت رندھیر کی نظر سانپ پر پڑی۔ وہ پاس ہی ایک جھاڑی میں چھپ رہا تھا۔

رندھیر، شانتا کی طرف متوجہ ہوا "کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

شانتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں۔"

رندھیر بولا "اُف بڑا خطرناک سانپ تھا۔ اگر تم دھکا نہ دیتیں تو ضرور مجھے ڈس جاتا"

شانتا نے کہا "میں نے سنا ہے کہ اس سانپ کے کاٹے ہوئے مر جاتے ہیں؟"

"ہاں! یہ بہت زہریلا ہے۔"

"مرتے وقت تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

"نہیں! کہتے ہیں کہ سانپ کے زہر سے نیند سی آجاتی ہے۔"

شانتا نے کہا "آپ کہتے تھے کہ آپ پھر یہاں نہیں آئیں گے؟"

"ہاں! لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارا دل دُکھے گا۔"

شانتا نے ہونٹوں پر غمگین مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "اب میرا دل نہیں دُکھے گا۔ اب اگر آپ آئے بھی تو مجھے نہیں دیکھیں گے۔"

"کیوں شانتا! تم کہیں جا رہی ہو؟"

شانتا نے کچھ دیر توقف کے بعد غنودگی کی حالت میں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا "شاید مجھے نیند آرہی ہے . . . . اس نیند سے شاید میری آنکھیں پھر نہ کھلیں۔"

رندھیر بدحواس ہو کر چلایا "شانتا! تمہیں سانپ . . . . ؟"

"ہاں! مجھے سانپ ڈس گیا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ آپ کے کسی کام آ سکی" شانتا یہ کہہ کر بیٹھ گئی اور اپنے ٹخنے کی طرف دیکھنے لگی۔

رندھیر ایک لمحہ کے لیے بھونچکا سا ہو کر رہ گیا اور پھر "شانتا! شانتا!" کہتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے منہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ شانتا کے پاؤں کو ٹٹولنے لگے۔ اس نے بے قرار سا ہو کر کہا "کہاں۔ شانتا کہاں؟"

شانتا نے ٹخنے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "یہاں۔ یہ دیکھو!"

رندھیر کو ٹخنے پر سرخ نشان کے درمیان ایک چھوٹا سا آبلہ دکھائی دیا۔

اس نے درد بھری آواز میں کہا "شانتا! تم نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟"

شانتا نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ رندھیر کی طرف دیکھا اور جواب دیا "سانپ آپ سے بہت قریب تھا۔ اگر میں آپ کو پرے نہ ہٹا دیتی تو . . . . !"

رندھیر کے دل میں اونچی ذات والوں کی نخوت کے قلعے کی مضبوط دیواریں جو پہلے ہی کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اب نابود ہو کر رہ گئیں۔ اچھوت لڑکی اسے پہلی بار ایک

عورت دکھائی دی۔ وہ عورت جو اس کے لیے اپنی جان پر کھیل سکتی تھی، جو موت کی بھیانک صورت دیکھنے کے باوجود مسکرا سکتی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا "رندھیر! تم اس محبت اور اس ایثار کے حق دار نہ تھے۔ تم کچھ دیر پہلے سماج سے خوف زدہ ہو کر اس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تم بزدل ہو۔ محبت اور خوف کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ محبت، نفع اور نقصان نہیں دیکھتی اس لڑکی کو دیکھو جو سانپ کے ڈسنے کے باوجود مسکرا رہی ہے۔ کاش! تم بھی اسی قدر بہادر ہوتے۔ لیکن اب کیا ہو گا؟ شانتا کی موت کے تصور سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نے رنج و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "شانتا! چلو۔ نہیں گھر چھوڑ آؤں۔ یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر ایک سپیرا رہتا ہے میں ابھی اسے لاتا ہوں۔"

شانتا نے مغموم آواز میں کہا "سپیرا، وہ کیا کرے گا؟"

"وہ زہریلے سے زہریلے سانپ کے کاٹے ہوئے کا زہر چوس لیتا ہے"

"لیکن میں نے سنا ہے کالے سانپ کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔"

"نہیں! اس کے پاس ہر سانپ کا علاج ہے۔ شانتا! تم بچ جاؤ گی!"

"لیکن آپ کہہ رہے تھے کہ آپ پھر یہاں نہیں آئیں گے۔"

"نہیں! میں جھوٹ کہتا تھا۔ میں ہر روز یہاں آؤں گا۔ میں تمہارے لیے تمام دنیا چھوڑ دوں گا۔ میں تمہارا ہوں۔ ہمیشہ تمہارا۔"

رندھیر کے ہر لفظ کے ساتھ شانتا کی سانس تیز ہو رہی تھی۔ ایک ساعت پیشتر رندھیر سے مایوس ہو کر اسے اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہونے پر کوئی ملال نہ تھا بلکہ سانپ کے ڈس جانے کے بعد اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے رندھیر پر آخری فتح حاصل کی ہے۔ لیکن اب رندھیر کی زبان سے

محبت کے اعتراف کے بعد اس کے لیے اس دنیا کا ہر کانٹا ایک مہکتا ہوا پھول بن گیا۔ رندھیر اس کا تھا اور وہ موت کے زبردست ہاتھوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اس کی دنیا میں رہنا چاہتی تھی۔ پہلے رندھیر کی محبت سے مایوس ہو کر اس کے لیے جینا دشوار تھا لیکن اب رندھیر کی محبت کے یقین کے ساتھ اس کے لیے مرنا مشکل تھا۔ زندگی کی آرزو نے موت کا چہرہ بے حد بھیانک بنا دیا۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے پوچھا "وہ سپیرا آ جائے گا؟"

"میں اسے ضرور لاؤں گا لیکن جلدی چلو۔"

شانتا اٹھی اور رندھیر اس کا بازو پکڑ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے کہا "میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ ذرا آہستہ چلو۔"

"نہیں شانتا! ہمیں جلدی پہنچنا چاہیے۔" شانتا نے کچھ دور اور اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دیا لیکن اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ دو تین بار اس کے پاؤں کو پتھروں کی ٹھوکریں لگیں اور رندھیر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر جھونپڑی کی طرف بھاگنے لگا۔

---

(۳)

شانتا کو اس حالت میں دیکھ کر کنول کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور رندھیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس میں زبان ہلانے یا آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی لیکن مامتا بدحواسی پر جلد ہی غالب آ گئی۔ اس نے کہا "تم کون ہو؟ شانتا کو کیا ہوا؟"

رندھیر نے شانتا کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے جواب دیا "اسے سانپ نے

ڈس لیا ہے!"

کنول یہ سن کر میری بیٹی! میری شانتا!! کہتی ہوئی شانتا کی طرف بڑھی اور اسے ہوش میں لانے کے لیے جھنجھوڑنے لگی۔

شانتا نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "ماتا! مجھے سونے دو۔"

"بیٹی بتاؤ! کہاں کاٹا سانپ نے؟"

شانتا نے لیٹے لیٹے ٹانگ سکیڑ کر ہاتھ کی انگلی ٹخنے پر رکھ دی اور کہا

"یہاں۔"

ٹخنے پر چھوٹا سا آبلہ اب کافی ابھر آیا تھا۔

رندھیر نے تسلی دیتے ہوئے کہا "آپ فکر نہ کریں میں ابھی سپیرے کو لاتا ہوں۔"

کنول نے کہا "یہ آبلہ کاٹ دیا جائے تو اچھا ہو گا۔"

"او ہو مجھے معلوم نہ تھا۔ لائیے کوئی تیز چیز! میں آج اپنے ساتھ خنجر بھی نہیں لایا۔"

کنول نے پریشان ہو کر کہا "کلہاڑیاں بدھو اور مادھو لے گئے ہیں اور کوئی تیز چیز گھر پر نہیں۔ ہاں ایک چیز ہے۔ اس کی نوک کافی تیز ہے۔" کنول بھاگتی ہوئی جھونپڑی میں گئی اور نیام سمیت ایک تلوار اٹھا لائی۔ نیام اگرچہ بہت پرانا تھا، لیکن کنول نے جب تلوار نکالی تو وہ چمک رہی تھی۔

کنول نے رندھیر کے ہاتھ میں تلوار دیتے ہوئے کہا "مجھ سے کاٹا نہیں جائے گا تم کاٹ دو۔ جلدی کرو۔"

رندھیر نے جلدی سے تلوار کی نوک سے آبلہ چیر دیا۔ تلوار نیام میں ڈالتے وقت اسے دستے پر اپنے باپ کے نام کے حروف دکھائی دیئے۔ اس نے حیران سا ہو کر

کنول کی طرف دیکھا۔ اور اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وقت کی نزاکت کے احساس سے خاموش رہا۔ اس نے کہا "اچھا اب میں جاتا ہوں۔ بہت جلد آؤں گا۔"

کنول نے پوچھا "کہاں رہتا ہے سپیرا؟"

"یہاں سے آٹھ کوس دور۔"

"آٹھ کوس! پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

"لیکن میرے پاس گھوڑا ہے۔ میں اسے جھیل پر چھوڑ آیا ہوں۔"

رندھیر جھونپڑی سے نکلا اور پوری رفتار سے جھیل کی طرف بھاگا۔ بادل تمام آسمان پر قبضہ جما چکے تھے۔ جھیل پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گھوڑا اپنی جگہ موجود نہیں۔ وہ گھوڑے کے غائب ہونے کی مختلف وجوہات سوچتا ہوا گھر سے دوسرا گھوڑا لینے کے ارادے سے شہر کی طرف بھاگا لیکن درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ شنکر گھوڑے کی لگام پکڑے شہر کی طرف جا رہا ہے۔ سرکش گھوڑا ہر قدم پر سیخ پا ہو رہا تھا اور شنکر خوف زدہ ہو کر ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑے دوسرے ہاتھ سے چھڑی ہلا ہلا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا

آج پھر شہر میں فوراً پہنچنا شنکر کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ آج وہ بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ رندھیر رام داس کا بیٹا ایک اچھوت لڑکی کے پاؤں چھو رہا تھا اور اسے دیوانوں کی طرح اٹھا کر سینے سے لگائے پھرتا تھا اے کاش! رندھیر تھوڑی دیر اور جھونپڑی میں رہے۔ لیکن یہ سرکش گھوڑا، یہ بد معاش! یہ ضدی! یہ بیوقوف جانور! جو ایک انسان کا بوجھ اٹھا کر ہوا کی طرح بھاگ سکتا تھا۔ شنکر کی بدقسمتی سے آج آگے بڑھنے کی بجائے الٹے پاؤں چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ یہ گھوڑا اس نے اس نیت سے اپنے ساتھ لیا تھا کہ رندھیر اس سے پہلے گھر نہ پہنچ جائے۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ گھوڑے کو بطور ثبوت پیش کرنے کے بعد وہ رام داس کو باقی تمام باتیں

سننے پر آمادہ کر سکے گا لیکن یہ گھوڑا؟ کاش اس کا منہ آج دُم کی طرف لگ جائے۔

رندھیر کی آواز آئی "شنکر ٹھہرو! شنکر ٹھہرو!!" اور شنکر کے سر پر بجلی گر پڑی اور پیٹ میں ناچنے والے چوہے دبک کر رہ گئے۔

گھوڑا رندھیر کی آواز سُن کر ہنہنایا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

رندھیر کی دوسری آواز آئی "کہاں لے جا رہے ہو اسے؟ ارے کہیں چھوڑ نہ دینا اسے اس کی لگام اوپر سے پکڑو۔"

شنکر بڑبڑایا "جی ہاں! جیسے اس کے منہ میں دانت ہی نہیں۔"

رندھیر نے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام پکڑی اور غصے سے بولا "بہت بے وقوف ہو تم۔ آخر تم نے وہاں سے اسے کھولا کیوں؟"

شنکر نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا "جی میں سمجھتا تھا کہ آپ شاید اس اچھوت لڑکی کے پریم میں اس بیچارے کو بھول گئے ہیں۔"

رندھیر نے بگڑ کر کہا "دیکھو شنکر! مندر سے باہر تمہارا کوئی کام نہیں اگر تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو پھر مجھے یہ خیال نہ ہو گا کہ تم برہمن ہو۔"

رندھیر کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور آن کی آن میں شنکر کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

سپیرا

آسمان پر مختلف رنگوں کے بادلوں کی تہیں ہموار ہو کر ایک دھندلے رنگ کے پردے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کوئی پانچ کوس فاصلہ طے کرنے کے بعد رندھیر کو موسلا دھار بارش نے آ لیا۔ ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد اس کے سامنے کسی حد تک ہموار میدان تھا۔ آخری کوس میں اسے کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں عبور کرنی پڑیں۔ وہ کیچڑ اور پانی سے لت پت شودروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں جو ایک ٹیلے پر آباد تھی، داخل ہوا، اور ایک جھونپڑی کے قریب پہنچ کر آوازیں دینے لگا "ارے کوئی ہے۔ کوئی ہے؟"

ایک عورت نے دروازے سے منہ نکال کر باہر جھانکا اور پیشتر اس کے کہ رندھیر اس سے کوئی بات کرتا وہ اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ عورت کے جاتے ہی ایک نوجوان نمودار ہوا اور گھوڑے کے قد و قامت سے اس سوار کی اہمیت کا اندازہ لگا کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

رندھیر نے سوال کیا "یہاں کوئی سپیرا رہتا ہے؟"

"جی مہاراج! اس کی جھونپڑی اس طرف بڑ کے درخت کے سامنے ہے۔ لیکن آج وہ یہاں نہیں۔ اگر آپ بارش میں آرام کرنا چاہیں تو ہماری جھونپڑی حاضر ہے لیکن ہم اچھوت ہیں۔ شاید آپ!"

رندھیر نے کہا "مجھے تمہاری جھونپڑی سے نفرت نہیں۔ لیکن میں آج ہی سپیرے

کو تلاش کرنا چاہتا ہوں وہ کہاں گیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "وہاں تو آپ آج نہیں پہنچ سکتے اسے آج صبح چند آدمی کسی کے علاج کے لیے دریا کے پار لے گئے ہیں۔"

"لیکن یہ بہت ضروری ہے وہ بستی کتنی دور ہے؟"

بستی تو دور نہیں۔ وہ دریا کے پار نظر آتی ہے لیکن ایسی بارش میں پتہ نہیں کس وقت پانی چڑھ جائے۔ آج کوئی دریا میں کشتی ڈالنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

رندھیر قدرے مایوس ہو کر گھوڑے سے اترا اور نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "دیکھو! یہ کسی کی زندگی کا سوال ہے۔ میں تمہاری مدد چاہتا ہوں مجھے کسی طرح دریا کے پار پہنچا دو۔"

نوجوان مذبذب سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

رندھیر نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتاری اور کہا "یہ لے لو! اس وقت میرے پاس اور کچھ نہیں۔"

شودر کے لیے اس کے کندھے پر اونچی ذات کے ایک باوقار نوجوان کی شفقت کا ہاتھ اس انگوٹھی سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔ اس نے کہا "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میری کشتی حاضر ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر طغیانی آگئی تو ہمیں اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔"

رندھیر نے پُر امید ہو کر جواب دیا "میں طغیانی میں بھی دریا کو عبور کر سکتا ہوں صرف اس سپیرے کو لانے کے لیے کشتی لے جانا ضروری سمجھتا ہوں۔"

نوجوان نے کہا "وہ پانی سے کچھ ڈرتا ہے لیکن شاید آپ سے انکار نہ کرے خیر دیکھا جائے گا ہم اسے زبردستی بھی لا سکتے ہیں۔ چلیے! میں آپ کا گھوڑا گھر میں باندھ دیتا ہوں۔ دریا یہاں سے بہت قریب ہے۔"

(۲)

نوجوان گھوڑے کو جھونپڑی کے اندر چھوڑ کر رندھیر کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں بھاگتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے۔ ماہی گیروں کی چار چھوٹی چھوٹی کشتیاں جن کے رسے کنارے پر لکڑی کی میخوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، پانی کی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھیں۔ نوجوان ماہی گیر نے کشتی میں پڑا ہوا ایک مٹی کا ٹھیکرا اٹھایا اور کشتی کا پانی نکالنے لگا۔ رندھیر نے دوسری کشتی سے اسی قسم کا ایک ٹھیکرا اٹھایا اور ماہی گیر کے ساتھ کام میں شریک ہو گیا۔ دونوں کو کشتی سے چند گھڑے پانی نکال کر دریا میں پھینکتے دیر نہ لگی۔

ماہی گیر نے رسہ کھولا اور بانس اٹھا کر کشتی کھینے لگا۔ رندھیر نے کہا "پانی ابھی چڑھا تو نہیں؟"

"نہیں! ابھی طغیانی نہیں آئی۔ پھر بھی پانی کافی تیز ہے۔"

ملاح کو منجدھار میں پہنچ کر چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہر لہر سے بچنے اور ہر بھنور سے نکلنے کے بعد یہی کہتا "سرکار! یہ تو کچھ بھی نہیں میں نے بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے اب وہاں ہمیں دیر نہ لگے تو اچھا ہو گا۔ پانی آہستہ آہستہ چڑھ رہا ہے۔"

دوسرے کنارے پر پہنچ کر ماہی گیر نے کشتی کا رسا ایک پتھر کے ساتھ باندھ دیا اور دونوں بھاگتے ہوئے کنارے سے کوئی دو سو قدم دور ایک بستی میں داخل ہوئے۔ ماہی گیر نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ گاؤں کے چودھری کا گھر ہے۔ چلئے! آپ یہاں بیٹھیں۔ میں سپیرے کا پتہ کرتا ہوں۔"

رندھیر نے جواب دیا "نہیں، تم پہلے یہ معلوم کرو کہ وہ کس گھر میں ہے۔ میں

تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

ماہی گیر جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد ایک عمر رسیدہ آدمی کو ساتھ لیے باہر نکلا۔ یہ گاؤں کا چودھری تھا۔ اس نے رندھیر کو دیکھتے ہی دور سے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ "مہاراج!" آپ یہاں اور ایسے موسم میں! چلیے آپ اندر بیٹھیں میں سپیرے کو بلاتا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"بہت اچھا سرکار۔ جو آپ کی آگیا۔ چلیے!"

رندھیر نے چلتے چلتے پوچھا۔ "وہ جس مریض کے علاج کے لیے یہاں آیا تھا اس کی اب کیسی حالت ہے؟"

سرکار! وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ آج پتہ نہیں کس چیز سے اس کے پاؤں پہ چھالا پڑ گیا۔ وہ ماں باپ کا ایک ہی لڑکا ہے اس کی ماں نے چھالا دیکھتے ہی دہائی مچا دی کہ میرے بچے کو سانپ کاٹ گیا ہے اور وہ لڑکا بھی عجیب بے وقوف ہے۔ ہم گئے تو بستر پر لیٹے کراہ رہا تھا۔ ہم جا کر سپیرے کو لے آئے تو وہ بھنگ پی کر ہم سب کو گالیاں دے رہا ہے۔ "تم سب بدمعاش ہو۔ تم نے مجھے بارش میں خراب کیا ہے۔"

رندھیر نے کہا "میں نے سنا ہے کہ وہ ہر قسم کے سانپ کا علاج کر لیتا ہے۔"

"سرکار! اس میں شک نہیں وہ پاگل جیسا ہے لیکن ہم نے یہی دیکھا ہے کہ وہ سانپ کے ڈسے ہوئے کے پاس وقت پر پہنچ جائے۔ تو پھر اسے مرنے نہیں دیتا۔"

---

(۱۳)

یہ تینوں باتیں کرتے ہوئے ایک جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ سپیرا گاؤں کے چند آدمیوں کے درمیان بیٹھا بھوتوں، چڑیلوں اور سانپوں کی داستانیں سنا رہا تھا اس کا ایک چیلا اسے بھنگ کا ایک کونڈا پلا چکا تھا اور دوسرا رگڑ کر تیار کر رہا تھا۔

چودھری نے سپیرے کے قریب جا کر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے اونچی آواز میں جواب دیا "نہیں! — کبھی نہیں!! — ہرگز نہیں!!! — اس وقت راجہ بھی چل کر آئے تو بھی نہیں جاؤں گا۔"

چودھری نے کھسیانا سا ہو کر باقی لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا "تم جانتے ہو، یہ کون ہیں؟ یہ بیاس کے پار اونچی ذات والوں کے شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور اس ملک میں اس شہر کا سردار ہی ایک ایسا آدمی ہے جو ہماری قوم سے نفرت نہیں کرتا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ شہر سے اونچی ذات کا ایک آدمی ایسی حالت میں دریا عبور کر کے ہماری قوم کے ایک سپیرے کو بلانے کے لیے آیا اور اس نے کورا جواب دیا تو اسے یقیناً دکھ ہوگا۔"

لوگ یہ سن کر ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے اور چودھری سپیرے سے مخاطب ہوا۔ "کالو! جانتے ہو یہ لوگ تمہیں بیڑیاں پہنا کر بھی لے جا سکتے ہیں۔"

رندھیر نے چودھری کی گفتگو کو ذرا زیادہ موثر بنانے کی نیت سے کہا "شہر کے سردار میرے پتا ہیں۔ تاہم میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ بے شک انہیں بارش میں تکلیف ہوگی لیکن جس کی جان بچانے کے لیے میں انہیں لے جانا چاہتا ہوں آپ کی قوم کی ایک لڑکی ہے۔ اس نے میرے پیروں میں سانپ دیکھ کر میری جان بچانا چاہی اور سانپ نے اسے ڈس لیا۔"

سردار کے بیٹے کے سامنے لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے اور چودھری نے کہا "مہاراج! آپ کے لیے ہم سب کی جانیں حاضر ہیں" اور پھر سپیرے سے مخاطب ہوا "کالو! اٹھتے ہو یا ہم زبردستی اُٹھائیں؟"

کالو کے دماغ سے بھنگ کے اثرات ابھی زائل نہ ہوئے تھے تاہم لوگوں کے تیور دیکھ کر اس کی جرأت خوف میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے گھگھیا کر کہا، "دیکھو! مجھے بارش میں باہر نہ نکالو۔ میں مر جاؤں گا۔ دریا میں کشتی الٹ جائے گی اور مجھے..... مجھے مگرمچھ کھا جائیں گے۔ تم نے مگرمچھ نہیں دیکھے، میں نے دیکھے ہیں یہ دریا مگرمچھوں سے پٹا پڑا ہے۔" سپیرے کو بھنگ کے نشے میں جھونپڑی میں تمام آدمی مگرمچھ نظر آنے لگے۔ وہ چلّایا۔ دیکھو یہ مگرمچھ! مگرمچھ!! اور اٹھ کر جھونپڑی کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

چودھری نے کہا "اس نے آج بھنگ بہت زیادہ پی ہے لیکن ہم اس کا نشہ اترنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ بارش میں اس کا دماغ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ چھجّو! تم اس کا تھیلا اُٹھا لو۔"

ایک شخص نے سپیرے کا تھیلا اٹھا لیا اور چودھری اور چار نوجوان اسے زبردستی پکڑ کر باہر لے آئے۔ سپیرے نے کچھ دیر ہاتھ پاؤں مارے۔ گالیاں دیں لیکن نوجوانوں کی آہنی گرفت اور موسلا دھار بارش نے جلد ہی اس کا دماغ ٹھنڈا کر دیا اور اس نے کہا "اچھا! مجھے چھوڑ دو۔ میں چلتا ہوں۔"

کنارے پر پہنچ کر رندھیر کو معلوم ہوا کہ دریا کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ وہ پتھر جس کے ساتھ کشتی کا رسّا باندھا گیا تھا پانی میں ڈوب چکا تھا۔ نوجوان ملّاح کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر رندھیر نے چودھری کی طرف دیکھا اس نے کہا "مہاراج! خطرہ تو ہے لیکن میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں آپ تیرنا جانتے ہیں نا؟"

رندھیر نے جواب دیا "تم میری فکر نہ کرو۔ میں پانی سے نہیں ڈرتا اور اس لڑکی کی جان بچانے کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔"

سپیرا یہ سن کر شور مچانے لگا "مجھے تیرنا نہیں آتا میں ڈوب جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔" لیکن لوگوں نے اسے زبردستی کشتی میں ڈال دیا۔

اس کشتی میں صرف ایک بانس تھا چودھری نے ایک شخص سے دوسرا بانس لانے کے لیے کہا وہ بھاگ کر نزدیک ہی ایک کشتی سے دوسرا بانس لے آیا۔ رندھیر سپیرے کے قریب بیٹھ گیا اور چودھری اور نوجوان ماہی گیر کشتی کھینے لگے۔

جس وقت یہ دونوں ملّاح دھارے کی خطرناک موجوں کا مقابلہ کر رہے تھے سپیرے نے رازدارانہ لہجے میں رندھیر سے پوچھا "سچ کہو تمہیں تیرنا آتا ہے؟"

رندھیر نے جواب دیا "آتا ہے۔"

سپیرے نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "پھر یہ بدمعاش ضرور کشتی ڈبو دیں گے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس انہیں مجھ سے بیر ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں ڈوب جاؤں گا تو انہیں کون پوچھے گا۔ اگر آپ تیرنا نہ جانتے تو انہیں آپ کی حفاظت کا خیال ہوتا لیکن اب انہیں اطمینان ہے کہ آپ تیر کر بچ جائیں گے اور یہ بدمعاش کشتی اس طرح چلا رہے ہیں جیسے یہ دریا نہیں کوئی جوہڑ ہے۔"

رندھیر نے سپیرے کو تسلی دینے کی نیت سے کہا "تیرنا مجھے بھی نہیں آتا میں صرف مذاق کر رہا تھا۔"

"تو پھر ان سے کہو کشتی ہوشیاری سے چلائیں۔"

"انہیں ہم سے زیادہ فکر ہے۔"

"خاک فکر ہے۔ ان لوگوں کا آپ کو اس وقت پتہ لگے گا، جب کشتی

الٹ جائے گی۔ وہ لہر آرہی ہے' وہ بھنور آگیا اور وہ دیکھو کیا آرہا ہے۔ ارے مگرمچھ! وہ ایک بہتی ہوئی لکڑی دیکھ کر چلانے لگا۔

چودھری کے تجربے اور نوجوان ماہی گیر کی ہمت نے کشتی کو صحیح سلامت دوسرے کنارے پہ پہنچا دیا اور یہ چاروں بھاگتے ہوئے بستی میں داخل ہوئے نوجوان جھونپڑی سے گھوڑا لے آیا۔ سپیرے نے کہا "اب تو شام ہونے والی ہے۔ ہم شہر کیسے پہنچیں گے؟"

رندھیر نے کہا "آپ گھوڑے پر میرے پیچھے بیٹھ جائیں ہم ابھی پہنچ جائینگے"

"باپ رے باپ! میرا باپ، میرا دادا، میرے دادے کا دادا بھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوا۔ اور یہ گھوڑا تھیں یہ تو کوئی جن ہے۔ میرا تو اس کی شکل دیکھ کر دم نکل رہا ہے۔"

چودھری نے رندھیر سے کہا "آپ گھوڑے پر چڑھ کر یہ تھیلا پکڑ لیں۔ ہم اسے آپ کے پیچھے لاد دیتے ہیں۔"

رندھیر نے جلدی سے گھوڑے پر بیٹھ کر تھیلا پکڑ لیا اور چودھری اور اس کے ساتھی نے چیختے چلاتے سپیرے کو اٹھا کر اس کے پیچھے لاد دیا۔

رندھیر نے رخصت ہونے سے پہلے ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا "میں تمہارے نام پوچھ سکتا ہوں۔"

نوجوان ملاح نے جواب دیا "میرا نام نتھو ہے۔" اور چودھری بولا "میرا نام دھرمو ہے۔" ہمیں افسوس ہے کہ آپ بارش میں آئے اور بارش میں جا رہے ہیں۔ ہم آپ کی کوئی سیوا نہ کر سکے۔"

"آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب بھگوان سے التجا کریں اس کی جان بچ جائے۔ میں آپ سے پھر کبھی ملوں گا۔"

رندھیر نے گھوڑے کی باگ ذرا ڈھیلی کی اور سپیرا خوف زدہ ہو کر اس کی کمر کے ساتھ لپٹ گیا۔ دھرمو نے چند قدم گھوڑے کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا "کالو! ہم سے ناراض نہ ہونا۔ تم ایک اچھے کام کے لیے جا رہے ہو۔ اگر تم اس لڑکی کی جان نہ بچا سکے تو ہم سب کی بدنامی ہو گی۔"

گاؤں سے باہر نکل کر رندھیر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ سپیرا چلا رہا تھا "آہستہ! ذرا آہستہ!! تمہیں اپنے بھگوان کی قسم! اپنے دیوتاؤں کی قسم!!"

نصف راستہ طے کرنے کے بعد رندھیر کو رات کی تاریکی نے آلیا اور اس نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی۔ بارش کا زور قدرے کم ہو چکا تھا لیکن تاریکی میں ایک قدم آگے دیکھنا دشوار تھا اور آخری دو کوس کے ٹیلے اور پہاڑیاں ایک دوسرے سے بہت مشابہ تھے اس لیے رندھیر نے صحیح راستہ تلاش کرنے کی ذمہ داری گھوڑے کی فراست پر چھوڑ دی۔

جب گھوڑا راستے کے آخری ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ رندھیر کا دل دھڑکنے لگا اور وہ انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ شانتا کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر جب اسے کوئی آواز سنائی نہ دی تو اسے کچھ تسلی ہوئی بدھوا اور مادھو گھوڑے کی آہٹ پا کر جھونپڑی سے باہر نکلے۔ مادھو نے آواز دی۔ کون رندھیر؟"

اس نے بے قراری سے پوچھا "شانتا کیسی ہے؟"

"اسے ہوش نہیں۔" مادھو نے آگے بڑھ کر رندھیر کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ اور پوچھا "سپیرا نہیں آیا؟"

"یہ میرے پیچھے ہے اسے اتار دو!"

بدھو نے آگے بڑھ کر سپیرے کو اُترنے کے لیے سہارا دیا۔ رندھیر نے تھیلا مادھو کو تھما دیا اور نیچے اتر کر کہا: "اسے کہاں باندھوں؟"

بدھو نے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "میں اسے چھپر کے نیچے باندھ آتا ہوں۔ مادھو! تم انہیں اندر لے چلو!"

---

(۴۸)

چراغ کی دُھندلی روشنی میں رندھیر کو شانتا ایک چارپائی پر بے ہوش لیٹی ہوئی دکھائی دی۔ کنول اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

سپیرے نے پوچھا: "کہاں کاٹا سانپ نے؟"

کنول، مادھو اور بدھو اس سوال کا جواب دینا چاہتے تھے لیکن سب سے پہلے رندھیر نے اس کے ٹخنے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: "یہاں۔ آبلہ میں نے کاٹ ڈالا تھا۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ لڑکی بچ جائے گی۔ مجھے سانپ بھی زیادہ زہریلا معلوم نہیں ہوتا۔"

سپیرے نے یہ کہتے ہوئے زخم پر منہ رکھ دیا اور اسے چوس چوس کر تھوکنے لگا۔ سوزش کے علاوہ شانتا کی پنڈلی زخم کے نزدیک سیاہ اور باقی سُرخ ہو چکی تھی۔ جب تک زخم سے سرخ خون نہ نکلا سپیرا اُسے چوستا رہا۔ اس کے بعد اُس نے اپنے تھیلے سے لکڑی کی ایک ڈبیا نکال کر کھولی اور اس میں سے سیاہ رنگ کا سفوف زخم پر چھڑک دیا۔ شانتا نے سفوف کی جلن سے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور بستر پر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

سپیرے نے کہا "اسے تھوڑی دیر کے لیے پکڑ لو۔"

بدھو نے اس کی ٹانگیں اور مادھو اور رندھیر نے اس کے بازو پکڑ لیے۔ شانتا نے ان کے ہاتھوں کی گرفت میں بے بس سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کی نگاہیں رندھیر کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ سپیرے نے کنول کی طرف دیکھ کر کہا "تمہارے گھر میں گھی ہے تو جلدی سے گرم کر لاؤ!"

کنول نے اٹھ کر ایک کوزے سے مٹی کی پیالی میں گھی نکالا اور جھونپڑی کے ایک کونے میں چولھے کے سامنے جا بیٹھی۔ چولھے میں موٹی لکڑی کا ایک سرا سلگ رہا تھا۔ کنول نے اس کے ساتھ دو لکڑیاں رکھ کر پھونکیں ماریں اور پیالی بھڑکتی ہوئی آگ پر رکھ دی۔

سپیرے نے تھیلے سے دوسری ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ایک اور سفوف نکال کر اپنی ہتھیلی پر ڈالتے ہوئے کنول کو آواز دی "بس لے آؤ اسے زیادہ گرم کرنے کی ضرورت نہیں۔" کنول گھی لے آئی اور اس نے کہا "اٹھو بیٹی! یہ دوائی کھا کر گھی پی لو۔ بس کل تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

مادھو نے ہاتھ کا سہارا دے کر شانتا کو بٹھا دیا۔

شانتا نے کہا "میں دوا کھا لیتی ہوں۔ گھی نہ پیوں گی۔ مجھے متلی ہو جائے گی۔"

بدھو نے کہا "بیٹی! تمہیں پینا پڑے گا۔"

کنول بولی "شانتا بے وقوف نہ بنو۔"

شانتا نے مایوس سی ہو کر رندھیر کی طرف دیکھا اور اس نے صرف اتنا کہا: "پی لو شانتا!" ان الفاظ میں ایک التجا تھی جسے وہ ٹھکرا نہ سکی۔ ایک حکم تھا جس سے انحراف اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ رندھیر کی خواہش پر وہ زہر کا پیالہ بھی حلق سے اتار سکتی تھی۔ شانتا نے مسکراتے ہوئے اپنا منہ کھول دیا۔ سپیرے نے دوائی منہ

میں ڈالی اور کنول نے اپنے ہاتھ سے اسے گھی پلانا چاہا لیکن اس نے پیالی اپنے میں پکڑ لی اور گھی پی کر فاتحانہ انداز میں رندھیر کی طرف دیکھنے لگی۔ رندھیر خوشی سے مسکرا رہا تھا۔

سپیرا زمین پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے کوئی منتر پڑھنے لگا۔

شانتا کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر رندھیر اس کے منتر سے زیادہ اس کی دوا کے اثر کا قائل ہو رہا تھا۔ تھکے ہوئے سپیرے نے جلد ہی اپنا منتر ختم کر دیا۔

شانتا کی حالت سے مطمئن ہو کر رندھیر کو اب بھوک اور تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ بدھوا ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔ گھر میں روٹی، دودھ اور مکھن کے علاوہ تازہ مچھلی کافی مقدار میں موجود تھی لیکن اسے رندھیر کو کھانے کی دعوت دینے کی جرأت نہ ہوتی اور اس کی موجودگی میں سپیرے سے پوچھنا بھی مناسب خیال نہ کیا۔ چھوت چھات کے علاوہ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ رندھیر سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا کھانے کا عادی ہو گا۔ اگر بفرضِ محال وہ اس کی دعوت قبول کر بھی لے تو بھی مٹی کے پیالوں کو ہاتھ لگانا اس کی توہین ہو گی۔ لیکن سکھدیو بھی کوئی معمولی آدمی نہ تھا اسے مٹی کے برتنوں سے نفرت نہ تھی۔ یہ بھی شاید بالکل سکھدیو جیسا ہے۔ شاید اسے بھی مٹی کے برتنوں سے نفرت نہ ہو۔ آخر پوچھ لینے میں کیا ہرج ہے اس خیال سے بدھوا کو کچھ تسلی ہوئی اور رندھیر سے مخاطب ہونے کے لیے موزوں الفاظ سوچنے لگا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ سکھدیو، کنول کی وجہ سے مٹی کے برتنوں میں کھانے اور جھونپڑیوں میں رہنے کے لیے مجبور تھا اور اسے کوئی مجبوری نہیں مگر شانتا؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ رندھیر اور شانتا ایک دوسرے کے لیے کنول اور سکھدیو بن چکے ہوں۔ اس نے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی خاموش نگاہیں گردوپیش سے بے خبر ایک دوسرے کو کوئی پیام دے رہی تھیں۔ وہ پیام جو روزِ ازل سے ہر ذی روح انسان اپنی جنسِ مقابل

کو دیتا چلا آیا ہے۔ بدھوا نے اپنے دل میں کہا "یہ جوڑا برا نہیں لیکن اس کا انجام؟ کیا رندھیر شانتا کے لیے اتنی بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار ہو گا!!"

رندھیر نے کہا "میں اب گھر جاتا ہوں۔ پتا بہت پریشان ہوں گے۔ میں صبح پھر آؤں گا۔"

بدھوا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ رندھیر نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتاری۔ اور سپیرے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ نے آج بہت دیا کی۔ میرے پاس اس وقت اور کوئی شے نہیں میں صبح پھر آؤں گا۔ جب تک شانتا اچھی نہ ہو آپ یہاں سے نہ جائیں۔"

سپیرے نے سونے کی انگوٹھی کو بھوکی نگاہوں سے دیکھا اور ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کنول بول اٹھی "نہیں! نہیں!! یہ نہیں ہو گا۔ آپ اپنی انگوٹھی اپنے پاس رکھیں۔ آپ نے ہم پر بہت دیا کی ہے۔" کنول نے اٹھ کر ایک پٹاری کھولی اور ایک انگوٹھی نکال کر سپیرے کو پیش کرتے ہوئے کہنے لگی:

"آپ کے احسان کا بدلہ ہم لوگ نہیں دے سکتے لیکن میرے پاس اس سے زیادہ قیمتی چیز اور کوئی نہیں۔ یہ شانتا کے باپ کی آخری نشانی ہے۔"

سپیرے نے پوچھا "وہ مر چکا ہے؟"

"ہاں!" کنول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سپیرے نے کہا "بیوہ کا دھن ہم پر حرام ہے تم اسے اپنے پاس رکھو۔"

رندھیر نے سپیرے کا ہاتھ پکڑ کر اس پر اپنی انگوٹھی رکھ دی اور اس نے چپکے سے سفوف والی ڈبیا میں رکھ کر اپنے تھیلے میں ڈال لی۔

کنول نے کہا "بیٹا! تم یہ پہن لو ورنہ مجھے دکھ ہو گا۔"

رندھیر نے جواب دیا "نہیں ماتا! اسے اپنے پاس رکھیں۔" لیکن بدھوا اور مادھو